تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ایس۔اُردو

الطاف فاطمہ کے ناولوں میں تذکیریت: تحقیقی مطالعہ

محقق:

سیدہ ام الشعاع

226-FLL/MSURDU/F19

نگران:

ڈاکٹر سائرہ بتول

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

شعبہ اُردو، کلیہ زبان وادب

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

Accession No. TH25429

MS
891.4393
س ی ا

اردو ادب - ناول

" " - تحقیق و تنقید

" " - تذکیریت

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **SYEDA UMM-U-SHOA**

Title of the Thesis: الطاف فاطمہ کے ناولوں میں تذکیریت: تحقیقی مطالعہ

Registration No: **226-FLL/MSURD/F19**

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Dr. Kamran Abbas Kazmi
Chairperson
Department of Urdu
Islamabad

External Examiner:

Dr. Shehnaz Parveen
Assistant Professor
Margalla College, E-7/4,
Islamabad

Internal Examiner:

Dr. Shiraz Fazal Dad
Assistant Professor
Department of Urdu, IIUI,
Islamabad

Supervisor:

Dr. Saira Batool
Assistant Professor
Department of Urdu, IIUI
Islamabad

الجامعة الإسلامية العالمية

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ سیدہ ام الشعاع رجسٹریشن نمبر 226.FLL/MSURDU/F19 نے ایم۔ایس۔ اُردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے تحقیقی مقالہ بعنوان **"الطاف فاطمہ کے ناولوں میں تذکیریت: تحقیقی مطالعہ"** میری نگرانی میں رقم کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران: ڈاکٹر سائرہ بتول

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

269924

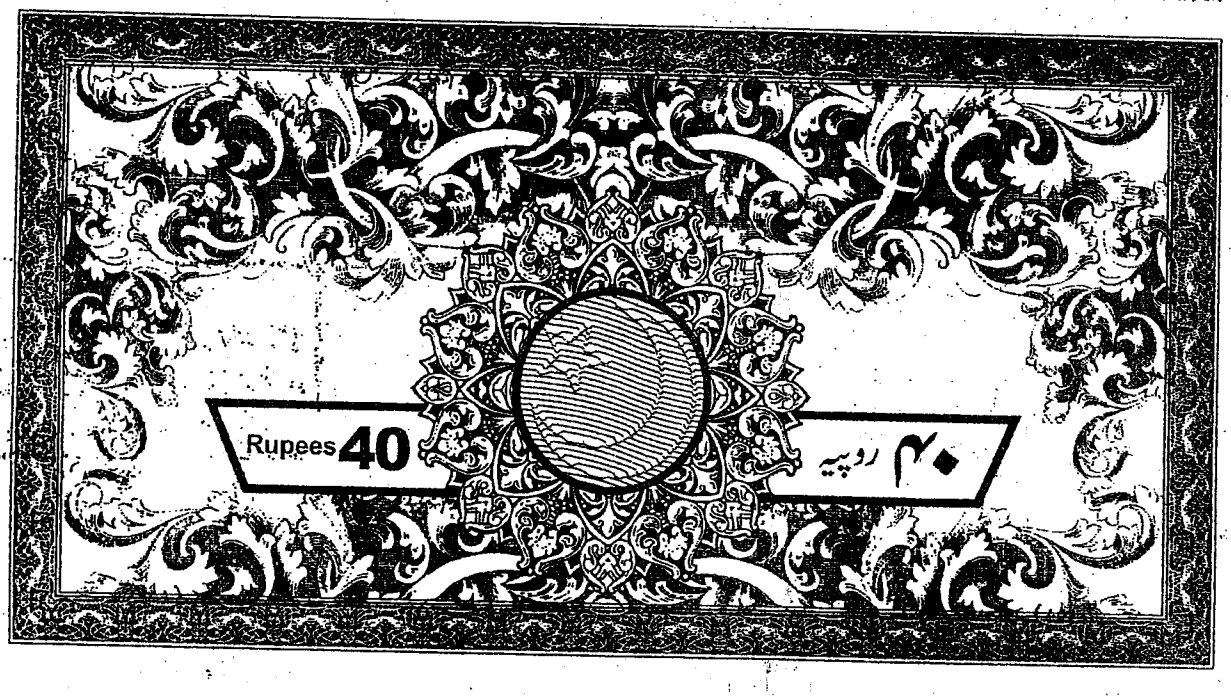

بیان حلفی

منکہ مسماۃ **سیدہ ام الشعاع** ولدیت **سید برکات احمد**، رجسٹریشن نمبر 226-FLL/MSURDU/F19، شعبہ **اردو**، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد میں برائے **ایم ایس اردو**، کی سکالر ہونے کی حیثیت سے اپنا مقالہ بعنوان **الطاف فاطمہ کے ناولوں میں تذکیریت: تحقیقی مطالعہ**، نگران استاد، **ڈاکٹر سائرہ بتول**، مکمل کیا ہے۔

مسماۃ **سیدہ ام الشعاع** ولدیت **سید برکات احمد**، اس بات کا حلفاً اقرار کرتی ہوں کہ مقالہ ہذا ہر قسم کے سرقہ سے پاک ہے۔ مسماۃ **سیدہ ام الشعاع**، نے مقالہ ہذا کو کسی اور ڈگری کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ پیش کروں گی۔ ان تمام حقائق کا اقرار کرتی ہوں کہ میں نے کوئی امر مخفی نہیں رکھا۔ لہذا غلط بیانی کی صورت میں ہر قسم کی ذمہ داری مسماۃ پر عائد ہوگی۔

العـــــــــــــارض

مسماۃ سیدہ ام الشعاع ولدیت سید برکات احمد

رجسٹریشن نمبر 226-FLL/MSURDU/F19

شناختی کارڈ نمبر 61101-7366702-4

شعبہ: اردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

TARIQ IQBAL MALIK
ATTESTED
Notary Public
Islamabad
Pakistan
Advocate High Court

15 JUN 2022

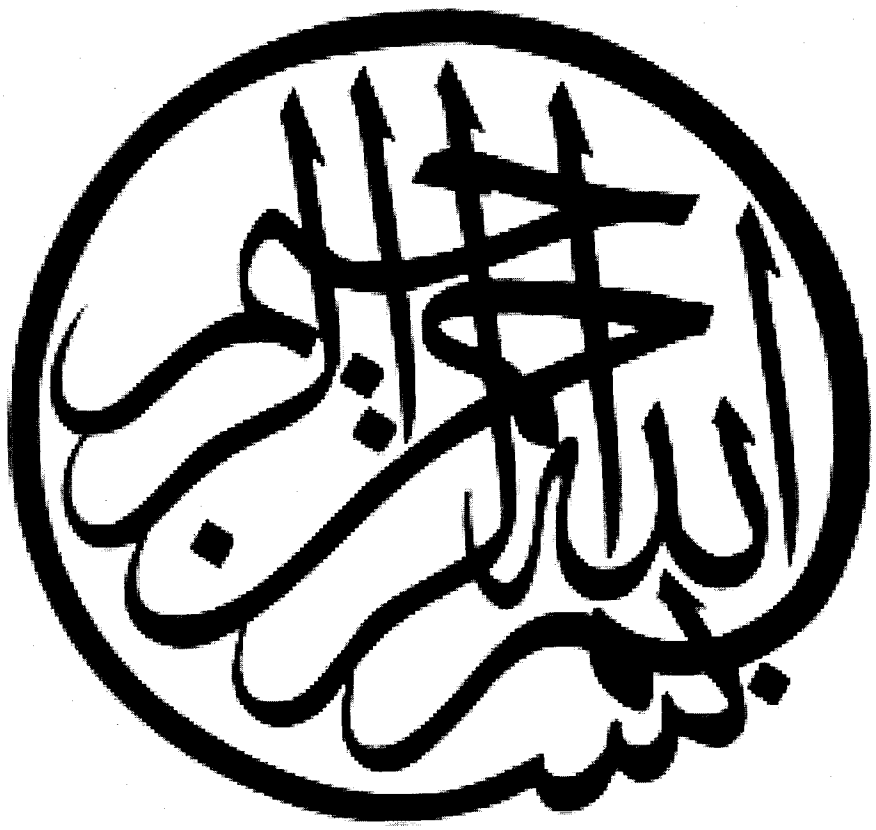
بسم الله الرحمن الرحيم

پیش لفظ

انسان نے جب اس دنیا پر قدم رکھا ہے تب سے ہی قدرت کے رازوں سے پردہ اٹھانا اور نت نئی تخلیقات کرنا اس کا شیوہ رہا ہے۔ انسان کی اسی تخلیقی صلاحیت کے سبب ہی اسے اشرف المخلوقات کا درجہ ملا ہے۔ انسان ازل سے ہی علم کا متلاشی نظر آتا ہے۔ تجسس اور تحقیق انسان کے جزو لاینفک ہیں اور اسی کے سبب انسان نیا علم ایجاد کرتا ہے۔ آج انسانیت نے جتنی بھی ترقی کی ہے وہ اسی تجسس اور تحقیق کی وجہ سے کی ہے۔ تحقیق صداقت اور حق کی تلاش کا نام ہے اسی وجہ سے تحقیق کا عمل کبھی رکتا نہیں ہے۔ تحقیق ہی انسانیت کے ارتقاء کا باعث ہے۔

یہ تحقیقی مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب "تذکیریت کے بنیادی مباحث" سے متعلق ہے۔ اس باب میں تذکیریت کے معنی و مفہوم، تذکیریت کے حوالے سے مختلف مغربی ماہرین کی آرا کو اس میں شامل کیا گیا ہے، رابرٹ ووڈ کے مضمون How to write a damn good man کی روشنی میں تیار کردہ تذکیری تھیوری کے نکات کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس کے بعد اس باب کے حصہ (ب) میں الطاف فاطمہ کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

باب دوم "الطاف فاطمہ کے ناولوں اور مرد کرداروں کا پس منظری مطالعہ" ہے اس میں ناول کے اجزائے ترکیبی کو بیان کرنے کے بعد الطاف فاطمہ کے چاروں ناولوں نشان محفل، دستک نہ دو، چلتا مسافر اور خواب گر کے پس منظر کو بیان کیا گیا ہے۔

باب سوم میں "الطاف فاطمہ کے ناولوں کے مرد کرداروں کی مثالی تذکیری صفات "کا رابرٹ وود کی تذکیری تھیوری کے تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں الطاف فاطمہ کے ناولوں کے مرد کرداروں کے مکالماتی انداز تکلم کا رابرٹ ووڈ کی تھیوری کے مطابق جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

میں سب سے پہلے رب تعالیٰ کی شکر گزار ہوں جس نے مجھے ہمت و حوصلہ عطا کیا کہ میں ایم ایس اردو کا مقالہ پایہ تکمیل تک پہنچا سکی۔ اس کے لیے اللہ رب العزت کا جس قدر شکر ادا کروں کم ہے اسی ذات نے تحقیق کے دوران پیش آنے والی مشکلات کو دور کیا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ جس کام کی تکمیل چاہتا ہے اس کے لیے وسائل بھی مہیا فرما دیتا ہے۔ میں اپنی نگران ڈاکٹر سائرہ بتول کی شکر گزار ہوں جنھوں نے ہر لمحہ اپنے مشفقانہ انداز میں میری رہنمائی کی جس کی بدولت مقالہ بر وقت تکمیل کی منزل تک پہنچا۔ میں شعبہ اردو کی تمام اساتذہ کرام کی شکر گزار ہوں جنھوں نے میری رہنمائی کی۔

اس مقالے کی تکمیل میں بالخصوص میں اپنے والد سید برکات احمد (مرحوم) اور اپنی والدہ کی دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکر گزار ہوں۔ جن کی دعاؤں اور محنت کی بدولت یہ مقالہ تکمیل کو پہنچا۔ اس کے علاوہ میں اپنے بھائیوں سید شفقات احمد، سید حسنات احمد اور سید عرفات احمد کی سپاس گزار ہوں۔ جنھوں نے قدم قدم پر میری مدد کی اور حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ میری ہمت بھی بڑھائی۔ میں اپنے رفیق حیات سید یاسر حسین کا شکر ادا کرنا بھی ضروری سمجھتی ہوں جن کے تعاون کے بغیر یہ مقالہ اپنی تکمیل کو پہنچنا ممکن نہ تھا۔ آخر میں میں اپنی خالہ، اپنی تمام دوستوں بالخصوص عائشہ فاطمہ اور حمیرا نظام کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جنھوں نے میرے ساتھ تعاون کیا۔ ان تمام افراد کی مشترکہ کاوش کی بدولت ہی یہ مقالہ مکمل ہوا۔

سیدہ ام الشعاع

مئی ۲۰۲۲

فہرست موضوعات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	
۱۔	**باب اول:**	
	الف۔ تذکیریت کے بنیادی مباحث	۱
	ب۔ الطاف فاطمہ کی شخصیت و فن کا اجمالی جائزہ	۱۵
	حوالہ جات	۲۴
۲۔	**باب دوم:**	
	الطاف فاطمہ کے ناولوں اور مرد کرداروں کا پس منظری مطالعہ	۲۷
	حوالہ جات	۵۴
۳۔	**باب سوم:**	
	الطاف فاطمہ کے ناولوں کے مرد کرداروں کی مثالی تذکیری صفات کا تجزیاتی مطالعہ	۵۶
	حوالہ جات	۱۱۰
۴۔	**باب چہارم:**	
	الطاف فاطمہ کے ناولوں کے مرد کرداروں کے مکالماتی انداز تکلم کا جائزہ	۱۱۴
	حوالہ جات	۱۴۶
	ماحصل	۱۴۹
	کتابیات	۱۵۹

باب اول:

تذکیریت کے بنیادی مباحث

باب اول:

تذکیریت کے بنیادی مباحث

اختلاف جنس اور صنف کے باعث مرد اور عورت میں فرق پایا جاتا ہے۔ جنس (Sex) حیاتیاتی طور پر متعین ہوتی ہے یعنی یہ فرق فطری طور پر پایا جاتا ہے۔ جب کہ صنف (Gender) کا تعین سماجی طور پر ہوتا ہے۔ اس کا تعلق مردوں اور عورتوں کے اس کردار اور ذمہ داریوں سے ہے جنھیں ہمارا خاندان، معاشرہ اور ہماری ثقافت تشکیل دیتے ہیں۔ صنف کے تصور میں نسائی و تذکیری کردار، استعداد اور صلاحیت کے متعلق توقعات بھی شامل ہیں۔ یہ وہ توقعات اور شخصی خصائص ہیں جن کی معاشرہ توقع کرتا ہے۔ صنفی کردار اور توقعات سیکھی جاتی ہیں اور یہ وقت اور ثقافتی تناظر میں تبدیل بھی ہوتی رہتی ہیں۔ سماجی تجزیہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ کس طرح خواتین کی محکومیت اور مردوں کا تسلط معاشرے میں سماجی طور پر قائم کیا گیا ہے۔ یہ اختیارات حیاتیاتی طور پر پہلے سے طے شدہ نہیں ہیں اور نہ ہی ہمیشہ کے لیے طے شدہ ہیں۔

اسی صنفی تقسیم کے باعث مختلف مباحث نے سماجی اور ادبی طور پر سر اٹھایا اور یہ سوالات پیدا ہوئے کہ آیا صنف ایک معاشرتی تعمیر ہے ؟ جنس اور صنف میں کیا فرق ہے ؟ جنس اور صنف کے درمیان کیا تعلق ہے ؟ ان مباحث کو ادب کا موضوع بنایا گیا۔ خواتین میں بیداری کی لہر پیدا ہوئی جس نے تانیثیت کی تحریک کو جنم دیا۔ جس میں خواتین نے اپنے حقوق کی خاطر آواز بلند کی۔ خواتین کے متعلق نظریات کو تانیثیت کہا جاتا ہے۔ جب کہ مردوں کے متعلق نظریات Masculinity کے ضمن میں آتے ہیں۔ Masculinity کے لیے اردو میں "تذکیریت" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

تذکیریت کے معنی اور مفہوم:

فرہنگ آصفیہ کے مطابق:

تذکیر۔ عربی۔ اسم مونث۔ مذکر ہونا۔ نر پن۔ نر پنا۔ مردانیت۔ مردیت[1]

فیروز اللغات اردو جدید میں تذکیر کے معنی کچھ یوں ہیں:

تذکیر (تذ۔ کیر) (عربی۔ اسم مونث) مذکر ہونا۔ مرد ہونا[2]

مولوی نور الحسن نیر کی لغت نور اللغات کے مطابق:

تذکیر۔(عربی۔مذکر۔کرنا۔یاد دلانا۔تذکرہ ہونا) مونث۔مذکر ہونا۔مرد ہونا[3]

Oxford Dictionary on Lexico.com کے مطابق Masculinity کے معنی یہ ہیں:

Qualities or attributes regarded as characteristic of men

handsome ,muscled ,and driven he is a prime example of masculinity[4]

اوصاف یا صفات جن کو مردوں کی خصوصیت سمجھا جاتا ہے۔خوب صورت، مضبوط اعصاب اور کار فرما ہونا تذکیریت کی بہترین مثال ہے۔

Merriam Webster dictionary میں masculinity کے معنی اس طرح بیان کیے گئے ہیں:

The quality or nature of the male sex, the quality ,state ,or degree of being masculine or mainly challenging traditional notions about masculinity and femininity.[5]

تذکیریت کے معنی مردانہ جنس کا معیار یا فطرت ہیں، جو تذکیریت اور نسائیت کے بارے میں روایتی تصورات کو چیلنج کرتا ہے۔

Oxford Learner's Dictionary کے مطابق کی masculinity تعریف یہ ہے:

the fact of being a man ;the qualities that are considered to be typical of men. [6]

Collins English Dictionary کے مطابق:

Masculinity means the qualities that are considered to be typical of men. The old ideas of masculinity do not work for most men.[7]

Masculinity کا مفہوم Cambridge Dictionary کے مطابق:

The characteristics that are traditionally thought to be typical of or suitable for mens.[8]

Your Dictionary نے masculinity کی تعریف یوں کی ہے:

Masculinity is defined as maleness ,or to the traditional qualities and characteristics associated with being a male.[9]

تذکیریت مردانگی کا معیار ہے۔عادات اور خصائل جنھیں معاشرہ مرد کے لیے مناسب سمجھتا ہے۔

Macmillan dictionary کے مطابق:

the qualities that are thought to be typical of men.[10]

اس ڈکشنری کے مطابق تذکیریت کے معنی وہ خصوصیات ہیں جو مردوں کے لیے خصوصی یا روایتی سمجھی جاتی ہیں۔

Vocabulary .com میں masculinity کی تعریف:

Masculinity is the quality of manliness _habits and traits that society considers to be appropriate for a man.[11]

تذکیریت جواں مردی یا شجاعت کا معیار ہے۔وہ عادات وخصائل جنھیں معاشرہ مرد کے لیے مناسب سمجھتا ہے۔

Urban Dictionary کے مطابق:

The properties characteristics of the male sex.

The trait of behaving in ways considered typical for men.[12]

تذکیریت سے مراد وہ کردار، رویے اور صفات ہیں جو کسی مخصوص معاشرے میں مردوں اور لڑکوں کے لیے مناسب سمجھی جاتی ہیں۔ انھیں بڑے پیمانے پر معاشرتی یا سماجی طور پر تعمیر کیا جاتا ہے۔ یہ کسی بھی معاشرے میں مردوں کے مقام کو واضح کرتا ہے۔

ScienceDirect نے تذکیریت یعنی Masculinity کی تعریف اس طرح کی ہے:

Masculinity is a form of gender, variously defined as an identity, a social role, and a form of power and is typically , though not exclusively , associated with men.[13]

صنفی کردار اور معاشرہ:

صنفی کردار (Gender Roles) ان مختلف توقعات جو افراد، گروہوں اور معاشروں میں افراد کی جنس اور صنف کے بارے میں ہر معاشرے کی اقدار اور عقائد کی بنیاد پر مبنی ہوتی ہیں۔ صنفی کردار افراد اور ان کے ماحول کے مابین تفاعل کی پیداوار ہیں۔ وہ افراد کو اس بارے میں اشارے دیتے ہیں کہ کس قسم کا برتاؤ کس جنس کے لیے مناسب سمجھا جاتا ہے۔ جنسوں کے مابین فرق و اختلاف کے بارے میں صنفی کردار کی تعریف معاشرتی عقائد کے مطابق کی جاتی ہے۔ صنفی کردار کی اصطلاح کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ صنف ایک سماجی اصطلاح ہے جو اکثر جنس کی اصطلاح کے ساتھ الجھ جاتی ہے۔

جنس اور صنف مختلف تصورات ہیں۔ جنس ایک حیاتیاتی تصور ہے جس کی بنیاد پر افراد کی بنیادی جنسی خصوصیات کا تعین کیا جاتا ہے۔ دوسری جانب صنف سے مراد وہ معنی، اقدار اور خصوصیات ہیں جو لوگ مختلف جنس سے منسوب کرتے ہیں۔

این اوکلے (Ann Oakley) پہلی سماجی سائنسدانوں میں سے ایک ہے۔ جس نے صنف کے تصور کو جنس کے تصور سے الگ کیا۔ اوکلے کے مطابق صنف مرد و عورت میں جنس کی حیاتیاتی تقسیم کو متوازی کرتی ہے۔ مگر اس میں نسائیت اور تذکیریت کی سماجی تشخیص اور تقسیم شامل ہے۔ دوسرے لفظوں میں صنف ایک ایسا تصور ہے جسے انسان سماجی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ اور ماحول کے تفاعل کے ذریعے تخلیق کرتے ہیں، پھر بھی یہ مردوں اور عورتوں کے درمیان حیاتیاتی فرق پر بہت زیادہ انحصار کرتا ہے۔ چوں کہ انسان سماجی طور پر صنف کا تصور تخلیق کرتے ہیں اس لیے صنف کو سماجی تعمیر کہا جاتا ہے۔ [۱۴]

جنس کی سماجی تعمیر اس حقیقت سے ظاہر ہوتی ہے کہ افراد، گروہ اور معاشرے خالصتاً جنس کی وجہ سے افراد کے لیے مخصوص خصلتوں، امتیازی وصف، حیثیت یا اقدار کو منسوب کرتے ہیں۔ پھر بھی یہ منسوبات مختلف معاشروں، ثقافتوں اور وقت کے ساتھ ساتھ ایک ہی معاشرے میں مختلف ہوتے ہیں۔

صنفی کردار وہ ہیں جن کی توقع مرد اور عورت سے ان کی جنس کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ بہت سے معاشرے روایتی طور پر اس پر یقین رکھتے ہیں کہ خواتین مردوں سے زیادہ بہتر بچوں اور گھر کی دیکھ بھال کرتی ہیں لہٰذا نسائی صنفی کردار کے بارے میں روایتی نقطہ نظر یہ تجویز کرتا ہے کہ خواتین کو اس طرح سے برتاؤ کرنا چاہیئے کہ وہ گھر کی بہترین دیکھ بھال اور بچوں کی پرورش کر رہی ہیں۔ ایک طریقہ جس سے عورت روایتی نسائی صنفی کردار میں شامل ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ گھر سے باہر ملازمت اختیار کرنے کی بجائے اپنے خاندان کی پرورش و دیکھ بھال میں اپنا تمام وقت صرف کر سکے۔ دوسری جانب روایتی نقطہ نظر کے مطابق مردوں کو صنفی کردار کے حوالے سے حاکم ہونا چاہیئے۔ اس لیے مردانہ صنفی کردار کے بارے میں روایتی نظریہ یہ تجویز کرتا ہے کہ مردوں کو اپنے گھر کا سربراہ ہونا چاہیے تاکہ وہ خاندان کی مالی معاونت کے ساتھ ساتھ خاندان کے اہم فیصلے کرے۔ اگرچہ یہ نظریات معاشرے کے بہت سے شعبوں میں غالب رہتے ہیں۔ اکیسویں صدی میں صنفی کرداروں کے بارے میں روایتی عقائد پر متبادل نقطہ نظر کو مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ مختلف شعبے صنفی کرداروں کے بارے میں مختلف نقطہ نظر پیش کرتے ہیں۔ صنفی کرداروں پر ماحولیاتی نقطہ نظر سے معلوم ہوتا ہے کہ صنفی کردار افراد، برادریوں اور ان کے ماحول کے درمیان تفاعل سے پیدا ہوتے ہیں یعنی فرد انفرادی طور پر بھی صنف کی تعمیر میں اپنا کردار ادا کرتا ہے اسی طرح سماجی ماحول جس کے اندر

لوگ کام کرتے ہیں یہ بھی صنف کی تعمیر میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ صنفی کردار کے بارے میں حیاتیاتی نقطہ نظر بتاتا ہے کہ عورتوں کا نسائی صنفی کردار سے فطری تعلق ہے اور مردوں کا مردانہ صنفی کردار سے فطری تعلق ہے۔ تاہم حیاتیاتی نقطہ نظر یہ تجویز نہیں کرتا کہ ایک کردار دوسرے کردار کے مقابلے میں فطری طور پر زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ صنفی کرداروں کے بارے میں عمرانی نقطہ نظر سے پتہ چلتا ہے کہ مردانہ اور نسائی صنفی کردار لازمی طور پر حیاتیاتی خصلتوں سے جڑے ہوئے نہیں ہیں۔ ماہرین عمرانیات ان مختلف معانی اور اقدار کا مطالعہ کرتے ہیں جو معاشرے میں مردانہ اور نسائی صنفی کردار رکھتے ہیں۔ عمرانیاتی نقطہ نظر سے متعلق 'صنفی کرداروں پر ایک نسائی نقطہ نظر اس بات پر زور دے سکتا ہے کہ چوں کہ صنفی کردار سیکھے بھی جاسکتے ہیں اور نہیں بھی 'اسی طرح مختلف کردار تخلیق بھی کیے جاسکتے ہیں۔ حقوق نسواں کا نقطہ نظر اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ صنفی کردار مردوں اور عورتوں کے لیے صرف مناسب رویوں کے بارے میں تصورات نہیں ہیں بلکہ وہ طاقت کی مختلف سطحوں سے بھی جڑے ہوئے ہیں جو معاشرے میں مرد اور عورت کے پاس ہیں۔ مثال کے طور پر خود پر اور اپنے خاندان پر اقتصادی کنٹرول برقرار رکھنا ایک ایسا طریقہ ہے جس سے مرد خواتین سے زیادہ طاقت کا تجربہ کرتے ہیں کیوں کہ مردوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے خاندان کے لیے کمانے والے ہوں۔ اگر خواتین کی شادیاں ٹوٹ جاتی ہیں تو اکثر وہ معاشی مسائل کا شکار ہوتی ہیں اس مثال میں ایک نسائی نقطہ نظر اس بات پر زور دے گا کہ مرد اپنی شادی کے معاملے میں عورت سے زیادہ طاقت رکھتے ہیں کیوں کہ اگر ان کی شادیاں ٹوٹ جائیں تو اس سے مردوں کی طاقت یا سماجی حیثیت سے محروم ہونے کا امکان کم ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر مرد اور عورت کے باہر کام کرنے کے حوالے سے بات کی جائے تو اس حوالے سے کانٹر (Kanter) کا کہنا ہے کہ:

In the workplace ,men and women are often expected to perform different tasks and occupy different roles based on their sex[۱۵]

یعنی کام کی جگہ پر 'اکثر مردوں اور عورتوں سے ان کی جنس کی بنیاد پر مختلف کام انجام دینے اور مختلف کردار ادا کرنے کی توقع کی جاتی ہے۔ اکیسویں صدی کے اوائل میں بھی بہت سی کارپوریشنیں اس نقطہ نظر سے کام کرتی ہیں جو صنفی کردار کے بارے میں روایتی عقائد کی حمایت کرتی ہیں مثال کے طور پر والدین کو چھٹیاں دینے کے حوالے سے وہ یہ فائدہ صرف ماں کو دیتے ہیں باپ کو ایسے فوائد دینے سے انکار کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں بہت سی کارپوریشنوں میں صنفی کرداروں کے بارے میں روایتی نقطہ نظر غالب رہتا ہے۔ اس لیے کارپوریشنوں میں خواتین اور مرد جو عہدہ رکھتے

ہیں وہ اکثر جنس کے لحاظ سے الگ ہوتے ہیں۔ خواتین سے سیکریٹری کے طور پر اور مردوں سے مینیجر اور ایگزیکٹو کے طور پر کام کرنے کی توقع زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مرد اپنے کام میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں جب کہ خواتین کو کام پر دوسروں کے ساتھ اپنے تعلقات کے حوالے سے فکر مند سمجھا جاتا ہے۔ جیسا کہ یہ مثالیں ثابت کرتی ہیں کہ بعض اوقات صنفی کردار صنف کے بارے میں دقیانوسی تصورات یا کلیشے کی بنیاد پر بنائے جاتے ہیں۔

تذکیریت کے بنیادی مباحث:

صنفی کردار تذکیریت اور نسوانیت کے تصور کو ماہر عمرانیات ٹالکوٹ پارسنز (Talcott Parsons) نے دریافت کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ معاشرتی تفریق معاشرے کی ضرورت تھی۔ اور اس کا مقصد بنیادی طور پر مردوں اور عورتوں کے درمیان تقسیم کار بچوں کو یقینی طور پر سماجی بنانا تھا۔

پارسنز اور بیلز (Parsons and Bales) کے مطابق باپ کا کردار "آلہ کار" اور ماں کا کردار "آئینہ دار" کا ہوتا ہے۔[16]

تذکیریت کی وضاحت خطرہ مول لینے کی خواہش، خود انحصاری، مضبوط شخصیت کا مالک ہونا، قائدانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنا، اپنے عقائد کا دفاع کرنا اور عقلی طور پر کام کرنا جیسی خصوصیات سے کی جاتی ہے۔ ایک حقیقی آدمی بننے کے لیے ایک فرد کو آرزومند، حاکم، مسابقتی، خود انحصار، جارح اور خود مختار کے طور پر دیکھنا ضروری ہے۔ تذکیریت کی زیادہ تر خصوصیات جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے ان کا تعلق اکثر تشدد کے اس کلچر سے جڑا ہوتا ہے جس پر مردانہ غلبہ ہوتا ہے۔ کچھ مرد روایتی تذکیری تصور کو قبول کرتے ہیں مثال کے طور پر روایتی تذکیری مرد کو مضبوط، جارح اور پر اعتماد ہونا چاہیئے۔ ایسے مرد اپنے جذبات دوسروں کو بتاتے ہوئے ہچکچاتے ہیں کیوں کہ انھیں ایسا لگتا ہے کہ اگر وہ اپنا مسئلہ دوسروں کو بتائیں گے یا اپنے جذبات کا اظہار ان کے سامنے کریں گے تو لوگ انھیں کمزور سمجھیں گے اور یہ تذکیری حوالے سے ان کے لیے ایک سنگین مسئلہ ہے کہ لوگ انھیں جذباتی طور پر کمزور یا افسردہ سمجھیں۔ کچھ مرد غیر روایتی تذکیری رویے کو قبول کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر غیر روایتی تذکیری مرد پرورش کرنے والے، غیر متحرک اور اپنے جذبات کا اظہار کرنے والے ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تذکیریت ان رویوں، زبانوں اور طریقوں پر مشتمل ہوتی ہے جو مخصوص ثقافت میں موجود ہیں۔ یہ رویے جنسی بنیاد پر مرد اور عورت کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں۔ تذکیریت کے لیے کوئی واضح معیار یا تصور موجود نہیں ہے۔ وقت اور ثقافت کے ساتھ یہ معیارات بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ جنس کی سماجی تعمیر دراصل طاقت کا ایسا نظام ہے جو نہ صرف مرد

اور عورت کو تذکیری اور نسائی حوالے سے تقسیم کرتا ہے بلکہ عام طور پر مردوں اور عورتوں کی طاقت کے مطابق کردار بھی تفویض کرتا ہے۔ جیسا کہ مرد محنت مزدوری کا کام کر سکتے ہیں مگر عورتوں کے لیے یہ کام آسان نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ یہ کام کریں تو مردان کے لیے بہت سی مشکلات کھڑی کر دیتے ہیں کیوں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ عورت کی فطرت کے خلاف ہے۔

نارمن (Norman) کے مطابق ثقافتوں کا موازنہ کرتے وقت تذکیریت کا تصور مختلف ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر مغربی ممالک جیسے کہ امریکا، آسٹریلیا اور ترکی میں تذکیریت کو اکثر مردوں کے ساتھ دقیانوسی ( ) stereotyped تصور کیا جاتا ہے۔ جس میں آزادی، جسمانی طاقت، جارحیت، مسابقت، معروضیت، عقلیت اور خواتین کے مقابل کم جذباتیت کا مظاہرہ کرنے جیسی خصوصیات کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ جب کہ خواتین کو مردوں کے مقابلے میں زیادہ تعاون کرنے والی، جسمانی طور پر کمزور، پیار کرنے والی، پر کشش، جذباتی، ماتحت، حلیم، مذہبی، خاموش طبع، غیر منطقی، متحمل اور مائل بہ گفتگو سمجھا جاتا ہے۔ Hofstede 1998 کے مطابق تذکیری معاشرے' رتبے اور مالی کامیابی کے لحاظ سے حقیقی کامیابیوں پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ کامیاب مردوں کے بارے میں سوچا جاتا ہے کہ وہ زیادہ جارحانہ، آرزومند اور سخت ہوتے ہیں بہ نسبت عورتوں کے جن سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ نرم مزاج، روزگار کے بارے میں کم سوچنے والی اور دوسروں کے ساتھ قریبی تعلقات استوار کرنے پر زیادہ توجہ مرکوز رکھتی ہیں۔[17]

مردوں کی غالب تصویر مسابقت اور طاقت کے ساتھ وابستہ ہے جب کہ خواتین جذباتی بہبود کے ساتھ زیادہ منسلک ہیں۔ والدین اپنے بچوں کو سماجی بناتے وقت روایتی مرد اور عورت کے کردار کو تقویت دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر لڑکوں سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ جب وہ پریشان ہوں تو اپنے جذبات کا اظہار کریں۔ جب کہ لڑکیوں کی ایسی سرگرمیاں جنھیں غیر نسائی سمجھا جاتا ہے ان میں حصہ لینے کے لیے حوصلہ شکنی کی جاتی ہے جیسے کہ فٹ بال کھیلنا وغیرہ۔ مورے (Moore 2001) کے مطابق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تذکیریت کی غالب خصوصیات نوجوانی کے تخلیقی سالوں کے دوران سیکھی جاتی ہیں اور یہ رویے کی پر تشدد شکلوں سے منسلک ہے۔ عصری معاشرے میں یہ عقیدہ ہے کہ تشدد کا تذکیریت سے گہرا تعلق ہے۔ جارحیت اور تشدد کو اکثر روایتی تذکیری شناخت کے منفی پہلو کے طور پر سمجھا جاتا ہے۔ کچھ تحقیقات نے یہ ظاہر کیا ہے کہ پُر تشدد ثقافت میں رہنے والے لڑکے یہ سیکھتے ہیں کہ تشدد تنازعات کو حل کرنے اور دوسروں پر طاقت کا دعویٰ کرنے کا ایک طریقہ ہے۔[18]

۱۹۸۰ء کی دہائی کے آخر میں کونل (Raewyn Connell) نے بھی جنس اور تذکیریت کے حوالے سے کام کیا اور اس موضوع پر انھوں نے آرٹیکلز اور کتابیں لکھیں۔ کونل (Connell) تذکیریت کی سماجی تعمیر کے حوالے سے جانی جاتی ہیں اور وہ اس تحقیقی میدان کی بانیوں میں سے ایک ہیں۔ ۱۹۸۰ کی دہائی میں انھوں نے صنفی تعلقات کا ایک سماجی نظریہ "جنس اور طاقت ۱۹۸۷" (Gender and Power 1978) پیش کیا۔ جس میں اس نے اس بات پر زور دیا کہ صنف صرف ذاتی شناخت کا معاملہ نہیں ہے بلکہ یہ بڑے پیمانے پر ایک سماجی ڈھانچہ ہے۔ ان کی کتاب Masculinities (1995-2005) اس میدان میں ایک اہم حوالہ ہے۔ کونل (Connell) کا Hegemonic Masculinity یعنی قائدانہ تذکیریت کا تصور اہمیت کا حامل رہا ہے اور اس نے بہت سے مباحث کی طرف اپنی توجہ مبذول کروائی ہے۔

تذکیریت کے حوالے سے کونل (Connell) کا کہنا ہے کہ تمام معاشروں کے پاس صنف کے حوالے سے ثقافتی خیالات و توجیحات تو ضرور ہیں مگر سب کے پاس تذکیریت کا تصور موجود نہیں ہے۔ اس کے جدید استعمال میں یہ اصطلاح فرض کرتی ہے کہ کسی انسان کے رویے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ وہ انسان کس صفت یا شخصیت کا حامل ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ ایک غیر تذکیری شخص 'تذکیری شخص سے مختلف رویہ اختیار کرتا ہے وہ پُر تشدد ہونے کے بجائے پر امن ہوتا ہے، غلبے کے بجائے مصالحت کو فوقیت دیتا ہے، وہ مشکل سے ایک فٹ بال کو لات مار سکتا ہے اور وہ جنسی تعلقات نہیں رکھتا۔ لہٰذا یہ تصور انفرادی فرق پر یقین رکھتا ہے۔[۱۹]

۱۹۹۵ میں کونیل (Connell) نے قائدانہ تذکیریت hegemonic masculinity کا نظریہ بیان کیا کہ تذکیریت کی غالب صورت خواتین اور کم طاقت والے مردوں جیسے کہ ہم جنس پرست پر تسلط کا دعویٰ کرتی ہے۔ کونیل کا کہنا ہے کہ لڑکے اپنے والد کے رویے کو دیکھ کر پُر تشدد اور جارحانہ ہونا سیکھتے ہیں جو ان کی نظر میں "مرد کی طرح کام کرنے کا طریقہ" کے لحاظ سے رول ماڈل کا کام کرتا ہے۔ فیمنسٹ تھیورسٹ اس بات کا استدلال کرتے ہیں کہ پدرانہ معاشرہ خواتین کو محکوم بنانے کا ذمہ دار ہے۔ تذکیریت اور تشدد کے درمیان تعلق کو ابتدائی طور پر پارسنز (Parsons) نے وضع کیا تھا۔ ملز (Mills) کے مطابق زیادہ تر مطالعات میں مردوں کو تشدد کے مرتکب کے طور پر دیکھا جاتا ہے جب کہ خواتین کے تشدد کا شکار ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر خواتین کے مقابلے میں مردوں کا لڑائی کے ذریعے جھگڑے طے کرنے کا امکان چار گنا زیادہ ہوتا ہے، اس لیے وہ مرد جو دیگر مردوں اور خواتین کے مقابلے میں اگر یہ ظاہر کر سکیں کہ وہ اپنی حفاظت کر سکتے ہیں جس کے نتیجے میں خود اعتمادی زیادہ ہوتی ہے زیادہ تذکیری حیثیت رکھتے ہیں۔ تاہم اگر خواتین جارحیت یا تشدد کی شکلیں ظاہر کرتی ہیں تو ان کے رویے پر تنقید کا زیادہ امکان ہوتا ہے یا نسوانی رویوں کی عدم مطابقت کی وجہ سے باقی معاشرے سے پسماندہ ہو

جاتی ہیں۔ روبنسر (Rubenser) کے مطابق لڑکوں کو چھوٹی عمر سے ہی "ایک حقیقی آدمی" بننے کے لیے سماجی بنایا جاتا ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے خاندان کے لیے بہادری اور خطرات مول لینے جیسے خصائل کو ظاہر کرے۔[۲۰] تشدد کے حوالے سے کیمل (kimmel) کا کہنا ہے کہ:

> Fighting has been culturally and socially endorsed for male in many cultures and is seen to be tied to their masculine identity[۲۱]

یعنی کئی ثقافتوں میں مردوں کے لیے سماجی اور ثقافتی طور پر لڑائی کی تائید کی گئی ہے اور اسے ان کی تذکیری شناخت سے منسلک دیکھا جاتا ہے۔

۱۹۹۰ء میں ایک امریکی فلسفی اور صنفی تھیورسٹ جوڈتھ بٹلر (Judith Butler) نے اپنی کتاب Gender Trouble :Feminism and the Subversion شائع کی۔ جس میں انھوں نے صنف کے روایتی تصورات کو چیلنج کرتے ہوئے اپنا نظریہ صنفی کارکردگی پیش کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ مرد یا عورت کے پیدا ہونے سے رویے کا تعین نہیں ہوتا بلکہ لوگ معاشرے میں شامل ہونے کے لیے مخصوص طریقوں سے برتاؤ کرنا سیکھتے ہیں۔ صنف کا تعلق کارکردگی سے ہے۔ صنفی کارکردگی کے ذریعے ہم اس تصور کو تقویت دیتے ہیں کہ صنف کی صرف دو باہمی خصوصی اقسام ہیں۔ اندرونی عقیدہ یہ ہے کہ مرد اور عورت بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ کیوں کہ مرد اور عورت اس طریقے سے برتاؤ کرتے ہیں جو بنیادی طور پر مختلف دکھائی دیتے ہیں۔ صنف کو ایک معاشرتی تعمیر کے طور پر برقرار رکھا جاتا ہے۔ صنفی تعمیر بنیادی طور پر ایک سماجی تعلق ہے۔ یقیناً صنف اندرونی یا باطنی ہے اور ان افراد کے لیے اہمیت رکھتی ہے جو نسائیت اور تذکیریت کو محسوس کرنا چاہتے ہیں۔ بٹلر (Butler) کا کہنا ہے کہ ہم اس بات سے آگاہ ہیں کہ دوسرے لوگ صنف کے پیمانے سے ہمارے رویوں اور خصوصیات کا جائزہ لیتے ہیں۔ سماجی مفسرین کا کہنا ہے کہ صنف شخصی کے بجائے تفاعلی ہے۔ یہ معاشرتی تفاعل کی وجہ سے نمو پاتی ہے۔ صنف کو ہمہ گیر بھی کہا جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ ہمارے رویے کو ہمیشہ عورت یا مرد کے طور پر جانچتے ہیں۔

مزید یہ کہ بٹلر کے خیال میں جنس اور صنف کے اصول ان لوگوں کے اصول ہیں جو اقتدار میں ہیں۔ جسے وہ درست سمجھتے ہیں اسے معاشرے کے زیادہ تر لوگوں کی طرف سے درست سمجھا جاتا ہے۔

تذکیری مرد کے حوالے سے شگفتہ جبین کا کہنا ہے کہ:

> Masculine men are courageous ,able to resist the pressure of events around them. They have capabilities to fulfill all own and other's needs. They are allowing others to be feel safe with them and do not permit anyone to overstep their boundaries.[۲۲]

ان کی اس رائے سے ثابت ہوتا ہے کہ تذکیری مرد بہادر ہوتا ہے۔اس میں اپنے ارد گرد کے واقعات کو سنبھالنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔یہ اپنی اور دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے قابل ہوتے ہیں اور وہ دوسروں کو محسوس کرواتے ہیں کہ وہ ان کے ساتھ محفوظ ہیں اور کسی کو بھی اپنی حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔

ہیمنڈ (Hammond 2006) کا کہنا ہے کہ مرد اپنے جذبات پر قابو پا کر تذکیریت کے تصور کی پیروی کرتے ہیں۔اگر وہ ایسا نہ کریں تو دوسرے لوگ ان کے بارے میں یہ سوچ سکتے ہیں کہ وہ جذباتی طور پر کمزور ہیں۔اس کا مزید کہنا ہے کہ مرد اپنے جذبات پر مضبوط ہوتے ہیں کیوں کہ یہ ان کے جذباتی پابندی سے منسلک ہے،اور یہ ہمیشہ نسلی امتیازی تجربات کو معاف کرنے یا چھوڑنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتے۔ہیمنڈ کی اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جذبات پر قابو رکھنا مردوں کے لیے ایک تذکیری پابندی ہے دراصل ہمارا سماج ہی ہے جو مردوں کے لیے یہ رویہ متعین کرتا ہے۔اگر وہ ان رویوں یا کردار پر عمل نہ کریں تو وہ تذکیری کردار نہیں ہوتے۔

تھامسن (Thompson) کا کہنا ہے کہ مرد اپنی ضروریات کے مطابق صرف حیثیت،مقام اور عزت کے حصول کے لیے تذکیریت کے اصولوں کی پیروی کرتے ہیں۔اسی حوالے سے سٹیٹس اینڈ برک (Stets and Burke) نے ۱۹۹۶ء میں کہا کہ مرد منفی،غالب اور مخالف رویے کا اظہار کر کے تذکیری صنفی شناخت کو برقرار رکھتے ہیں جیسے کہ شکایت کرنا،عورتوں کو نیچا دکھانے کے لیے تنقید کرنا وغیرہ۔

جیمس اینڈ کلارک (James and Clarke) نے ۱۹۹۳ میں مکالماتی رویے پر تحقیق کی جس میں انھوں نے بتایا کہ مرد عورتوں کی نسبت زیادہ تحکمانہ اور پُر اعتماد گفتگو کے نمونے پیش کرتے ہیں۔مگر مکالماتی انداز میں مداخلت کے حوالے سے تجرباتی مطالعات کا حالیہ جائزہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ مرد سمجھتے ہیں کہ خواتین زیادہ باتونی ہوتی ہیں اور مردوں کے مقابلے میں گفتگو میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔[۲۳]

تذکیریت کے حوالے سے کیمل (Kimmel 2004) کا کہنا ہے :

> Masculine attributes are associated with gendered social roles that young males are expected to fulfill .For example traditional male attributes are associated with being dominant ,stoic and rational compared to female roles which are characterized as being submissive ,passive or irrational.[۲۴]

تذکیری خصوصیات صنفی سماجی کرداروں سے وابستہ ہیں جن کو پورا کرنے کی توقع نوجوان مردوں سے کی جاتی ہے۔مثال کے طور پر خواتین کا کردار اطاعت شعار،غیر متحرک اور ناقص العقل ہے اس کے مقابلے میں روایتی

تذکیری خصوصیات میں غالب ہونا، مستحکم اور صاحب عقل ہونا شامل ہے۔ لہٰذا معاشرہ مرد سے یہ توقع کرتا ہے کہ وہ ان خصوصیات کو اپنائے۔

رابرٹ ووڈ (Robert Wood) نے اپنے مضمون (How to write a damn good man) میں تذکیریت کی تھیوری پر روشنی ڈالی۔ رابرٹ ووڈ سٹینڈ آؤٹ بکس (Standout Books) کے ایڈیٹر اور ایک بلاگ مینیجر ہیں۔ انھوں نے سٹینڈ آؤٹ بکس کے بلاگ پر دو سو سے زائد مضامین لکھے ہیں۔ انھوں نے انگریزی ادبی تھیوری میں ماسٹرز کیا اور انگریزی ادب اور تخلیقی ادب میں بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے اپنے مضمون میں تذکیریت کی تھیوری پیش کی۔ اس کے نکات درج ذیل ہیں۔

۱۔ صنفی کارکردگی (Gender Performativity):

صنفی کارکردگی کا لفظ جوڈتھ بٹلر (Judith Butler) نے استعمال کیا۔ یہ اس نظریے کی وضاحت کرتا ہے کہ صنف کیا ہے اور کس طرح ہمیں متاثر کرتی ہے؟ بٹلر کے مطابق یہ توقعات اور اصولوں کا ایک مجموعہ ہے۔ جو ہمارے رویوں کی وضاحت کرتا ہے۔ اس تھیوری کے مطابق مرد عورت کی نسبت اپنے احساسات و جذبات کا اظہار کم کرتا ہے۔ اسے اپنے جذبات پر قابو پانا آتا ہے۔ مرد کا اظہاری رویہ معتدل طور پر سامنے آتا ہے۔ یہ بھی اسے معاشرہ سکھاتا ہے۔ ایک مرد کا اظہار اور اس کا صنفی تجربہ اس جانب رد عمل ہے کہ معاشرے نے صنف کو کس طرح بیان کیا ہے؟ کچھ رویے اور خصوصیات یا وصف تذکیری سمجھے جاتے ہیں اور مرد روزمرہ کی زندگی میں ان رویوں پر مسلسل رد عمل کا اظہار کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ اپنا موازنہ ایک مثالی آدمی سے کرتا ہے۔

۲۔ مثالی آدمی (Ideal man):

مثالی آدمی مکمل پن کی علامت ہوتا ہے یعنی وہ ذہنی، تخلیقی ہر لحاظ سے بہتر ہو اور ایک مکمل جنس کا مالک ہو۔ مرد مثالی آدمی کے حوالے سے اپنی ذاتی تذکیریت کی تعمیر کرتے ہیں۔ ایک مرد کبھی شعوری اور کبھی لاشعوری طور پر سوچتا ہے کہ ایک مثالی آدمی دی گئی صورت حال میں کیا کرے گا اور پھر اپنے رد عمل کا مثالی آدمی سے موازنہ کرتا ہے۔

۳۔ تحریر میں مثالی تذکیری صفات کی وضاحت (Defining Ideal Masculinity in Writing):

مثالی آدمی وہ ہے جو بہادر ہو۔ مشکل حالات کا جواں مردی سے مقابلہ کر سکے۔ دیگر کرداروں یعنی مردوں، عورتوں اور بچوں کی مدد کرے۔ اور لوگوں کی درست رہنمائی کر سکے۔ اس کی سوچ حقیقت پسندانہ ہو۔ وہ لوگوں کی قیادت کرے اور جسمانی قابلیت کا حامل ہو۔ یہ تمام تر مثالی آدمی کی خصوصیات ہیں۔ یہ وہ معیارات ہیں جو

اس کے کردار اور رویے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر مرد بہادر اور قابلیت کا حامل ہو یا ہونے کی کوشش کرے۔ مگر معاشرہ ایک مرد میں ان تمام خصوصیات کی توقع کرتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک مرد اپنے طریقے سے تصدیق کرے گا کہ وہ بہادر ہے۔ اس صورت حال کی مارٹے میفلے Marty Mcfly نے Back to future part 2 میں اس طرح وضاحت کی ہے۔ مارٹے کو ایک جان لیوا دوڑ پر بات کرنی پڑی جس پر اس کے حریف نے اسے chicken کے لقب سے نوازا۔ چوں کہ مارٹے Marty کا مثالی مرد کسی چیز سے نہیں ڈرتا اور جب اس کے حریف نے اسے کہا کہ وہ اس طرح کے مثالی آدمی کے طور پر نہیں رہ سکتا تو مارٹے اسے غلط ثابت کرنے کے لیے احمقانہ طریقوں میں پڑ گیا۔ یہاں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ یہ معیار ویسے نہیں ہیں جس کی بنا پر بیانیہ سے متفق ہونا پڑے۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ ایک ایسی کہانی تحریر کی جائے جس میں کردار تذکیریت کے کسی نظریے کو مثالی گردانے یا کردار میں مثالی تذکیریت ہو۔ ایسی ہی ایک کہانی (About a Boy) ہے جس کا کردار ول (will) ہے جو ایک کڑے تنہا پسند رویے کا مالک ہے اور اس کا ماننا ہے کہ جذباتی لگاؤ ایک خطرناک کمزوری ہے۔ لیکن ول میں تبدیلی اس وقت آئی جب وہ سکول کے ایک کمزور لڑکے ماکوس بریور (Marcus Brewer) کے ساتھ جذباتی طور پر جڑ گیا۔ اس نے اس لڑکے کو بدمعاش لڑکوں سے بچایا اور اس کا خیال رکھا۔ کہانی کہتی ہے کہ ول کے مثالی آدمی میں نقص تھا۔ اور جب اس نے اپنے تجربے سے تذکیریت کے نظریے کو بدلا تو وہ زیادہ خوش رہنے لگا۔ مرد کردار کے بارے میں لکھتے ہوئے انھیں نظریات کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ مرد کی نفسیات کے متعلق روایات (Male Psychological Narratives) :

کپلنگ (Kipling) کی نظم جنس یا تشدد کو زیادہ واضح طور پر بیان نہیں کرتی۔ گو کہ یہ دونوں تذکیریت کے زیادہ اہم اور کثرت سے بیان کیے جانے والے پہلو ہیں۔ یقینی طور پر مرد کے اندر دونوں چیزوں کے اچھا ہونے کی صلاحیت کی توقع کی جاتی ہے۔ لیکن ایسا بھی لگتا ہے کہ یہ جبریت اور تنہائی پسندی جیسی خصوصیات کے مخالف ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح سے مثالی آدمی کا کردار تشدد کو روکتا ہے جب کہ دوسرا آدمی تشدد کو تلاش کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں تذکیریت کو سمجھنے کے لیے یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ہیرو اور ولن کیسے مختلف ہو سکتے ہیں۔ حقیقت میں تذکیریت کی وسیع تعریف وہ ہے جس کی وضاحت کردار کرتا ہے۔ جو چیز ان میں مختلف ہے وہ مثالی آدمی سے ان کا تعلق ہے۔

اس کی موزوں مثال جیک شیفر (Jack Shefer) کی ایک مشہور چرواہے شین (Shane) کی کہانی ہے۔ شین ایک پیشہ ور بندوق ساز ہے۔ جو اپنے پُر تشدد ماضی کو پیچھے چھوڑنے اور تنہائی حاصل کرنے کے لیے ایک مویشی خانے میں کام کرنے کے لیے جاتا ہے۔ بدقسمتی سے مقامی غنڈوں نے اس کے مالکان کو نشانہ بنایا اور شین کو صورت

حال درست کرنے کے لیے پر تشدد کاروائی میں ملوث ہونا پڑا۔ مزید یہ کہ شین اتنا پر کشش تھا کہ کھیت کے مالک کی بیوی اس کی محبت میں مبتلا ہو گئی اور نے اس خاندان سے جس نے اسے پالا تھا اسے نقصان پہنچانے کے بجائے کھیت چھوڑ دیا۔ یہاں بیانیہ تعمیر کیا گیا ہے کہ یہ ایک غلطی کی طرف مائل تھا۔ تشدد سے بچنے کے لیے اس نے اپنی زندگی بدل ڈالی۔ مگر جب اسے زبردستی لڑنے کے لیے مجبور کیا گیا تو وہ جان لیوا ثابت ہوا۔ ناممکن طور پر مثالی آدمی کے قریب ترین ہے۔

۵۔ مردانہ مکالماتی انداز اور جسمانی حرکات (Male Dialogue and Body Language) :

مثالی آدمی صبر کرنے والا ہوتا ہے مگر وہ حیرت انگیز قابل قائد بھی ہوتا ہے۔ مثالی آدمی کا خاکہ بناتے ہوئے اس کی جسمانی حرکات اور مکالماتی انداز کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ مثالی آدمی ایک ماڈل ہوتا ہے۔ وہ جس بات کی بھی وضاحت کرتا ہے اسے سمجھنا آسان ہوتا ہے علاوہ ازیں وہ جاذب نظر بھی ہوتا ہے۔

مثالی آدمی کی جسمانی حرکات اور مکالماتی انداز کا خاکہ کھینچتے ہوئے مارول کومکس (Marvel comics) کے کردار کیج کو لے سکتے ہیں۔ کیج مثالی تذکیری صفات کا حامل ہے۔ وہ ایک قائد، جامع خطیب اور طاقت کا حامل ہے۔ کیج (Cage) معاملات کو پر امن طریقے سے حل کرنے کی کوشش میں بہت زیادہ دباؤ ڈالتے ہوئے گولی کا استعمال کر سکتا ہے۔ مگر وہ عدم تشدد کا انتخاب کرتا ہے۔ حالاں کہ تشدد عام طور پر اس کی کامیابی کی ضمانت دیتا ہے۔ بطور مثالی آدمی کیج کا مکالمہ اور جسمانی حرکات سادہ مگر موثر ہیں۔

یہاں کیج نے اس کے عالمی نقطہ نظر پر روشنی ڈالی، کاروائی کرنے کے عزم کا اظہار کیا لیکن ایسا کرتے ہوئے بے چین رہا۔ خاندان کے ساتھ اپنی وابستگی کی تعریف کرتے ہوئے اور زندگی کے ایک بڑے انتخاب کی تفصیل بتاتے ہوئے، کیج کافی کا گھونٹ لیتا ہے، آرام دہ اور پُر سکون رویہ دکھانے کے لیے مختصر طور پر دیکھتا ہے۔ جیسا کہ وہ دنیا کو تبدیل کرنے کے لیے اپنا ارادہ بیان کرتا ہے اس نے ایک ابرو اٹھایا۔ یہ ہلکی سی جسمانی حرکت اس کے الفاظ کو پر تاثیر بناتی ہے۔ کیج کے الفاظ شدید ذاتی اور جذباتی مطابقت رکھتے ہیں۔ یہ مثالی آدمی کی جسمانی حرکات اور مکالماتی انداز ہے۔ مرد کرداروں پر ایک لاشعوری اثر ہے یہ اعتماد کا قابل قبول معیار ہے۔ ایک ایسا طریقہ جس سے ایک پر اعتماد کردار برتاؤ کر سکتا ہے۔

۶۔ تذکیریت کا مکالماتی انداز (Masculinity as a Dialogue) :

تذکیریت کو متعارف کروانے والا ایک جز قائدانہ صلاحیت ہے۔ اس کی وجہ سے مرد کردار کسی بھی گروپ میں قابل ستائش جگہ حاصل کر سکتا ہے۔ یہ مقام اسے قابلیت کی بنا پر ملتا ہے۔

۷۔ مرد کے کردار پر لکھنا (Writing Male Characters) :

تذکیریت کا مطالعہ کرنا نہایت پیچیدہ عمل ہے۔ کسی مرد کے بارے میں لکھنے کا کوئی ایک طریقہ نہیں ہے۔ یہ کہنا کہ مرد اپنے جذبات و احساسات پر عمل نہیں کرتے یا انھیں سمجھ نہیں سکتے تو یہ بالکل غلط ہے۔ بلکہ مردوں کو ہمیشہ یہ سکھایا جاتا ہے کہ اپنے جذبات کا اظہار نہ کرنا تذکیریت کا حامل ہونا ہے۔ ایسا کہنا کہ مرد کے اندر جذبات و احساسات نہیں ہیں یہ ایک لطیفہ معلوم ہوتا ہے۔ زیادہ دلچسپ اور حقیقی کردار کا حامل وہ شخص ہے جو مضبوط اعصاب کا مالک ہو۔ اپنے احساسات اور جذبات کو چھپالے۔ اس کردار پر بھی غور کرنا چاہیے جو ان جذبات کو دبانے کی کوشش کرتا ہے مگر ناکام ہو جاتا ہے یا وہ کردار جس نے اپنے جذبات کو اتنے عرصے تک دبائے رکھا ہو کہ انھیں سامنے لانے میں دشواری ہو۔

اس کے علاوہ تذکیریت کے چند عمومی خصائص بھی ہیں۔

بہادری (Bravery)

جبریت (Stoicism)

تنہائی پسندی (Isolationism)

قائدانہ صلاحیت(Leadership)

جسمانی طاقت (Physical ability)

ہمارے معاشرے میں مرد و عورت کے لیے مختلف معیارات قائم کیے گئے ہیں جیسے عورت کا کام محض امور خانہ داری، بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال کرنا جب کہ مرد کا کام گھر سے باہر کے معاملات دیکھنا، اور گھر والوں کی ضروریات کا خیال رکھنا ہے۔ اسی طرح عورت کو کم عقل، نازک اور ضدی سمجھا جاتا ہے، جب کہ مرد کے خصائص میں بہادری، شجاعت، مہم جوئی جیسی خصوصیات شامل ہیں۔ اردو ادب میں خواتین کا خصوصی جب کہ مردوں کا عمومی طور پر مطالعہ کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس تحقیق میں رابرٹ ووڈ کی تھیوری کے تناظر میں الطاف فاطمہ کے ناولوں کا مطالعہ کیا جائے گا۔ اس تھیوری کے ذریعے تذکیریت کے خصائص کو تلاش کیا جائے گا۔

ب: الطاف فاطمہ کی شخصیت و فن کا اجمالی جائزہ:

الطاف فاطمہ کثیر الجہت شخصیت کی مالک ہیں۔ آپ بطور ناول نگار، افسانہ نویس، مترجمہ اور معلمہ کے اردو ادب میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ الطاف فاطمہ لکھنؤ (یوپی) میں واقع قیصر باغ "اونل ہاؤس" میں ۱۰ جون ۱۹۲۷ء کو پیدا ہوئیں۔ آپ کا گھرانہ خیر آبادی "سلسلہ علماء" کے نام سے ہندوستان میں پہچانا جاتا ہے۔ جذبہ حریت اس خاندان

کا خاصا تھا جو علم و ادب کے حوالے سے اپنی ایک خاص شناخت رکھتا ہے۔ الطاف فاطمہ کے آباؤ اجداد کا تعلق خیر آباد سے تھا جو جنگ آزادی کے بعد پٹیالہ کی ریاست میں شامل ہوا۔ آپ کے جد امجد علامہ فضل امام تھے۔

الطاف فاطمہ کی والدہ سیدہ ممتاز جہاں بیگم تربیت یافتہ و دینی و مذہبی خاتون تھیں۔ ان کے شوہر فضل امین اور سسر کی وفات کے بعد ان کے والد سید جعفر حسین شاہ انھیں اور ان کے چار بچوں کو اپنے ساتھ لکھنؤ لے گئے۔ جہاں وہ قیام پاکستان تک مقیم رہیں۔ انھوں نے اپنے شوہر کی وفات کے بعد بچوں کی تربیت و پرورش میں ماں اور باپ دونوں کا کردار ادا کیا۔ وہ بلند حوصلہ اور باہمت خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنی اولاد میں دنیاوی شعور پیدا کیا تا کہ وہ معاشرے کے بہترین فرد کی حیثیت سے زندگی گزار سکیں اور ان میں کسی قسم کا احساس محرومی پیدا نہ ہو۔ وہ اپنے بچوں کو کھیل ہی کھیل میں بہترین معلومات فراہم کرتیں۔ الطاف فاطمہ کا کہنا ہے:

> ہماری والدہ جب پریشان ہوتی تو کبھی شور شرابہ نہ کرتیں بلکہ وہ پریشانی میں کثرت سے مطالعہ کرتی تھیں۔ کھیل یہ کھیل میں ہمیں اس قدر اچھی معلومات فراہم کرتی کہ اتنی معلومات مطالعہ کرنے سے بھی حاصل نہ ہوئیں۔[۲۵]

الطاف فاطمہ کی والدہ نے اپنے بچوں میں سیاسی، معاشرتی و سماجی شعور پیدا کر کے انھیں معاشرے کا مہذب رکن بنایا۔ ان کی والدہ کی وفات ۱۹۶۴ء میں لاہور میں ہوئی۔

الطاف فاطمہ علمی و ادبی گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے گھرانے کے نہ صرف مرد حضرات بلکہ تمام خواتین بھی پڑھی لکھی تھیں۔ ان خواتین کا علم و ادب سے گہرا تعلق تھا۔ الطاف فاطمہ کی پھوپھی امت الرؤف کو چھوٹی عمر سے ہی ڈائری لکھنے کا شوق تھا۔ وہ افسانہ نگار تھیں ان کے افسانے محل سلطان جو کہ بھوپال کا مشہور ادبی رسالہ تھا اس میں شائع ہوتے۔ یہ وزیر ریاست گوالیار نواب سعید الدین کی زوجہ تھیں۔ یہ آل انڈیا ویمن کانفرنس کی رکن رہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "ہدیہ نسواں" کے نام سے ہے۔ اس گھرانے کی خواتین مطالعے کا بہت شوق رکھتی تھیں۔ جس وجہ سے اس وقت کے تمام رسالے اس گھرانے میں آتے اور پڑھے جاتے۔ علامہ راشد الخیری اور ڈپٹی نذیر احمد کی تصانیف کے علاوہ تہذیب نسواں، عصمت اور خواتین کے دیگر ادبی رسالے آتے اور ان کا مطالعہ بڑے ذوق و شوق سے کیا جاتا۔ یہ خواتین ادبی میلان رکھتی تھیں اور یہی ادبی میلان الطاف فاطمہ اور ان کے بہن بھائیوں میں پایا جاتا تھا۔

الطاف فاطمہ پانچ بہن بھائی تھے اور یہ دوسرے نمبر پر تھیں۔ الطاف فاطمہ کی سب سے بڑی بہن ارشاد فاطمہ ایک بہترین مصورہ تھیں۔ ۱۹۵۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔ الطاف فاطمہ کے بھائی فضل قدیر اردو ادب میں اعلیٰ درجے کے صحافی کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ پاکستان آنے کے بعد معاشی مشکلات کا شکار ہونے کے باوجود

انھوں نے ایم۔اے جرنلزم کا امتحان پنجاب یونی ورسٹی سے پاس کیا۔ فضل قدیر "ماہ نو" کے بھی مدیر رہے۔ وہ ایک بہترین ادیب بھی تھے اور انگریزی اخبار ڈان "Dawn" میں کالم بھی تحریر کرتے تھے۔ وہ انفارمیشن منسٹری میں پبلی کیشن کے محکمے سے وابستہ رہے۔ الطاف فاطمہ اور ان کے بھائی فضل قدیر نے ابتدائی تعلیم ایک ہی سکول (چرچ مشن سکول) سے حاصل کی۔ الطاف فاطمہ کو اپنے بھائی سے بے انتہا محبت تھی۔ بھائی کی وفات کے بعد وہ انھیں بہت یاد کرتیں۔ بالخصوص جب کسی کتاب کا مطالعہ کرتیں تو بھائی انھیں شدت سے یاد آتا۔ الطاف فاطمہ کا کہنا ہے کہ ہم جو بھی پڑھتے اور تحریر کرتے تھے وہ اپنے بھائی کو ضرور بتاتے اور اب جب بھائی موجود نہیں ہے تو اس کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے۔ فضل قدیر کا انتقال ۱۹۹۶ء میں ہوا۔ فضل حق الطاف فاطمہ کا دوسرا بھائی ہے جو دو برس کی عمر میں ہی انتقال کر گیا۔ الطاف فاطمہ کی چھوٹی بہن نشاط فاطمہ ہیں ان کی پیدائش والد کے انتقال کے بعد ہوئی۔ نشاط فاطمہ بھی اردو ادب کی ممتاز ناول نگاروں میں شامل ہیں۔ ان کا ناول "آنسو جو بہہ نہ سکے" کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ نشاط فاطمہ بہت سنجیدہ اور حساس طبیعت کی مالک تھیں۔ ان کے حوالے سے الطاف فاطمہ کا کہنا ہے کہ: "سچ پوچھیے تو اسی ہمدردی نے انھیں افسانہ نگار بنایا۔ ان کا دائرہ وسیع تھا اور وہ ہر قسم کے ملکی اور غیر ملکی لوگوں کے قریب رہیں اور ان کا مطالعہ کیا۔ یہ جذبہ ان کی ہر تصنیف سے ظاہر ہے۔"[۲۶]

الطاف فاطمہ نے ابتدائی تعلیم کا آغاز اپنے گھر سے ہی کیا۔ تعلیم کی ابتدا انگریزی سے کی۔ بعد ازاں فارسی زبان پڑھی۔ دراصل الطاف فاطمہ کے ماموں زاد بھائی محمود حامد جو لکھنؤ سے بی۔اے آنرز کر کے آئے تھے ان کا قیام انھی کے گھر پر تھا۔ جن استاد صاحب سے محمود حامد فارسی کی تعلیم حاصل کرتے تھے انھوں نے جب الطاف فاطمہ کو انگریزی پڑھتے ہوئے دیکھا تو ان کے دل میں اس خواہش نے جنم لیا کہ وہ اس بچی کو فارسی زبان پڑھائیں۔ انھوں نے اس خواہش کا اظہار کیا اور الطاف فاطمہ فارسی زبان پڑھنے لگیں۔ "فارسی آمدن نامہ" مولوی صاحب سے ہی پڑھا۔ گلستان و بوستان حافظ جنید احمد صاحب سے پڑھی۔ جب الطاف فاطمہ انگریزی اور فارسی پڑھنے لگیں تو ان کی والدہ نے اردو کی تدریس بھی شروع کر دی۔ شیخ سعدی کی حکایات الطاف فاطمہ کو ازبر ہوتی تھیں ان کے گہرے اثرات الطاف فاطمہ کی شخصیت پر پڑے اور انہی حکایات کی بدولت زندگی کے حوالے سے ان کے نظریات صوفیانہ ہو گئے۔ ان نظریات کا اثر ان کے ناولوں میں بخوبی نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ:

> شیخ سعدی کے افکار، فلسفہ زیست اور سماجی شعور کا میرے مزاج، فکر اور رویوں میں شروع ہی سے ایک کردار رہا ہے۔ یہ جانے کیوں چھوٹی چھوٹی اور سیدھے سادے انداز میں لکھی حکایتوں نے میرے دل میں دنیا کی وقعت کم کر دی۔[۲۷]

شیخ سعدی کے افکار کے اثرات الطاف فاطمہ کے مزاج اور ان کی فکر پر رہے ہیں۔

الطاف فاطمہ کی تعلیم کا آغاز چرچ مشن سکول سے ہوا۔ جہاں انھیں اور ان کے بھائی فضل قدیر کو داخل کروایا گیا۔ مگر الطاف فاطمہ نے باقاعدہ تعلیم کی شروعات لکھنؤ کے ایک مقامی سکول سے کی۔ ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان وجود میں آیا تو الطاف فاطمہ اور ان کا خاندان ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ وہ پاکستان کے شہر لاہور میں آباد ہوئے۔ ہجرت کے جس تجربے سے وہ گزریں اس کا اظہار ان کی تحریروں میں ملتا ہے۔ اس حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ:

> میری زندگی میں یہ تجربہ اس وقت پیش آیا جس کو زندگی کا بے حد خوب صورت اور لطیف دور کہا جا سکتا ہے کہ احساس اور جذبے انگڑائی لے کر بیدار ہونے ہی کو تھے۔ میرے نزدیک یہ تجربہ اور واردات انمول تھی۔[۲۸]

الطاف فاطمہ نے پاکستان آ کر اپنے تعلیمی سلسلے کا دوبارہ آغاز کیا اور ایف۔ اے کا امتحان پرائیویٹ طور پر دیا۔ ایف۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد اسلامیہ کالج کوپر روڈ لاہور میں داخلہ لیا اور وہاں سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۵۴ء میں ایم۔ اے اردو اورینٹل کالج سے امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ الطاف فاطمہ ایک ذہین و قابل طالبہ تھیں۔ وہ سید عابد علی عابد، سید وقار عظیم، ڈاکٹر عبارت بریلوی، ڈاکٹر سید عبد اللہ اور پروفیسر صوفی تبسم جیسے بہترین اساتذہ کرام کی شاگردی سے فیض یاب ہوئیں۔ ان اساتذہ نے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کے اساتذہ کا برتاؤ ان کے ساتھ نہایت مہربان اور مشفقانہ تھا۔ اپنے اساتذہ کے حوالے سے ان کا کہنا ہے: "میرے سب اساتذہ ہی نہایت شفیق اور مہربان تھے خصوصاً میرے ساتھ ان کا تعلق نہایت مشفقانہ اور دوستانہ رہا۔ ہم ان سے مختلف موضوعات پر ادبی گفتگو کیا کرتے تھے۔"[۲۹]

۱۹۶۵ء میں میکگلن کالج سے بی ایڈ کیا۔ کورس میں شارٹ ہینڈ اور ٹائپنگ کی مہارت حاصل کرنے کی غرض سے انھوں نے داخلہ لیا مگر صرف ٹائپنگ ہی سیکھی۔ چائیلڈ ویلفیئر کورس محکمہ بہبود کی جانب سے کیا۔ ۱۹۶۴ء میں الطاف فاطمہ نے ملازمت کا آغاز کیا۔ اسلامیہ کالج میں بطور استاد مقرر ہوئیں۔ بھٹو کے نیشنلائزیشن کے عہد میں ان کا تبادلہ کسی دوسرے کالج میں کر دیا گیا مگر طالبات کی ضد پر پانچ ماہ بعد ان کا تبادلہ دوبارہ اسی کالج میں کر دیا گیا۔ بعد ازاں وہ اسی کالج میں صدر شعبہ اردو کے عہدے پر فائز ہوئیں۔ ۱۹۸۸ء میں وہ اس عہدے سے ریٹائر ہوئیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی وہ اس پیشے سے الگ نہیں ہوئیں بلکہ انھوں نے اپوا کالج اور پھر ایک نجی کالج میں تدریس کے فرائض سر انجام دیے۔ دوران ملازمت الطاف فاطمہ کالج میگزین "محمل" کی مدیر اعلیٰ بھی رہیں۔ انھوں

نے اپنی نگرانی میں اس میگزین کو اعلیٰ پائے کا ادبی مجلہ بنایا۔ انھوں نے ایک ادبی میگزین کا اجرا "گل رعنا" کے نام سے کیا۔ ماہ پارہ صفدر نے ایک انٹرویو کے دوران ان سے سوال کیا:

> آپ اپنی پہچان کس طور پر پسند کریں گی۔ ناول نگار یا پھر افسانہ نگار کے طور پر۔ الطاف فاطمہ کا فوری اور برجستہ اور بڑے ہی تیقن سے جواب دیا۔ نہ ناول نہ افسانہ نگار میں تو ایک استاد ہوں۔ میرے شاگرد میرے افسانے ہیں۔ میں نے اپنے شاگردوں میں جو جذبہ اور ادب شناسی پیدا کی ہے وہی میری زندگی کا سرمایہ ہے۔[۳۰]

الطاف فاطمہ نے ادبی زندگی کا آغاز طالب علمی کے دوران ہی کر دیا تھا۔ وہ کسی ادبی گروہ سے وابستہ نہ تھیں۔ انھوں نے ہجرت کے تجربات سے فائدہ اٹھایا اور اس کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا علاوہ ازیں ترقی پسند تحریک اور رومانوی تحریک دونوں کے اثرات قبول کیے اور ادیبہ بن گئیں۔ ان کا پہلا افسانہ " پھر اس رہ گزر کی باتیں کریں" بنت راوی میں شائع ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے باقاعدہ طور پر افسانے لکھنے کا آغاز کیا بعض اجلاس کی صدارت بھی کی اور ۱۹۷۳ء تک باقاعدہ ان اجلاس کا حصہ رہیں۔

الطاف فاطمہ افسانہ نگار کی حیثیت سے بلند مقام رکھتی ہیں مگر ان کا ادبی میدان ناول نگاری ہے۔ معاشرتی مسائل کو انھوں نے اپنے افسانوں میں نہایت خوب صورتی سے بیان کیا۔ وہ معاشرتی حوالے سے قدیم روایات کی حمایت کرنے والی تھیں۔ الطاف فاطمہ کے پانچ افسانوی مجموعے شائع ہوئے جو درج ذیل ہیں:

۱۔ وہ جسے چاہا گیا ۲۔ جب دیواریں گریہ کرتی ہیں ۳۔ تار عنکبوت ۴۔ دید و دید
۵۔ گواہی آخر شب کی

"وہ جسے چاہا گیا" الطاف فاطمہ کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ پہلی مرتبہ یہ اردو ڈائجسٹ میں شائع ہوا۔ اس کو بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔ یہ مجموعہ ۱۹۶۹ء میں پہلی مرتبہ چھپا اور دوسری مرتبہ ۲۰۰۴ء میں فیروز سنز کی جانب سے شائع ہوا۔ اس کا دیباچہ سید وقار عظیم نے لکھا۔

"جب دیواریں گریہ کرتی ہیں" دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں دس افسانے شامل ہیں۔ اس کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت ۱۹۸۸ء میں قصور آرٹ پریس لاہور سے ہوئی۔ جب کہ دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۳ء میں سمیع سنز پرنٹرز کراچی سے شائع ہوا۔ ان افسانوں میں تہذیبی بحران کا شکار معاشرے اور ماحول کو پیش کیا گیا ہے۔

الطاف فاطمہ کا تیسرا افسانوی مجموعہ "تار عنکبوت" ہے۔ یہ مجموعہ فیروز سنز لاہور سے ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ اس میں چودہ افسانے ہیں۔ اس کا انتساب بے زمینی کا دکھ اٹھانے والوں کے نام ہے۔

"دیدودید" الطاف فاطمہ کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے۔اس میں چوبیس افسانے شامل ہیں۔اس کا دیباچہ "سپاس نامہ" کے عنوان سے خود الطاف فاطمہ نے لکھا اور انتساب نیئر مسعود کے نام ہے۔یہ مجموعہ ۲۰۱۷ء میں جمہوری پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا۔اس افسانوی مجموعے کے افسانوں کو ۱۱/۹ کے تناظر میں تحریر کیا گیا ہے۔

"گواہی آخر شب کی" الطاف فاطمہ کا اخری افسانوی مجموعہ ہے۔اس مجموعے میں آٹھ شخصی خاکے اور تینتیس افسانے شامل ہیں۔یہ مجموعہ جمہوری پبلی کیشنز لاہور سے ۲۰۱۸ء میں شائع ہوا۔اس مجموعے میں الطاف فاطمہ نے چند شخصیات سے متعلق اپنی یادیں بھی شامل کی ہیں جن میں ان کی والدہ سیدہ ممتاز جہاں،رضی ترمذی،ماموں سید رفیق حسین،شاہد احمد دہلوی اور دیگر شخصیات شامل ہیں۔وکیل انجم الطاف فاطمہ کی افسانہ نگاری کے متعلق اپنی رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> ان کی پہچان افسانہ نگار کی حیثیت سے بنی۔افسانوں میں انھوں نے روایت کو ترک کرتے ہوئے نئے موضوعات کو چھیڑا ہے۔محبت کا ذکر ان کے افسانوں میں کثرت سے ملتا ہے۔مگر محبت ان کے افسانوں میں مختلف رنگ وروپ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ان کے نزدیک محبت زندگی کا ایسا محرک ہے جو انسان کو نیکی اور خیر کی تحریک دیتا ہے۔محبت کے علاوہ الطاف فاطمہ کے افسانوں میں معاشرت کا جائزہ بھی خوب صورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔معاشرتی رجحان کے تحت الطاف فاطمہ کا اہم موضوع مادیت پرستی سے نفرت کا اظہار ہے۔مادی زندگی پر طنز اور جدید عہد کی بناوٹی زندگی سے نفرت کے احساس کو موضوع بنا کر الطاف فاطمہ نے کئی افسانے لکھے جن میں "زندہ حقیقت" "ویراں شہر کے بے قامت لوگ" اور "کمرہ نمبر پانچ" کو اہم افسانے قرار دیا جاسکتا ہے۔[۳۱]

الطاف فاطمہ نے طالب علمی کے دوران ہی پہلا ناول "نشان محفل" تحریر کیا جسے پذیرائی حاصل ہوئی۔مگر ان کو شہرت ان کے دوسرے ناول "دستک نہ دو" سے حاصل ہوئی۔انھوں نے کل چار ناول لکھے۔پہلا "نشان محفل" جو مکتبہ دانیال لاہور سے ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔یہ ضخیم ناول سات سو صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں مشرق ومغرب کی عورت کے درمیان پائے جانے والے فرق کو واضح انداز میں بیان کیا ہے۔یہ عشق کی ایک اداس کر دینے والی کہانی ہے۔

دوسرا ناول "دستک نہ دو" ہے۔یہ ناول فیروز سنز لاہور سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔اس ناول کو اتنی پذیرائی حاصل ہوئی کہ اسے ہاتھوں ہاتھ خریدا گیا۔اس ناول کے مرکزی کردار گیتی آراء اور صفدر یاسین (لیوچو) ہیں۔یہ بھی ضخیم ناول ۷۸۷ صفحات پر مشتمل ہے۔اس ناول کو ڈرامائی شکل میں پاکستان ٹیلی ویژن پر نشر بھی کیا گیا۔

الطاف فاطمہ کا تیسرا ناول "چلتا مسافر" ہے۔ یہ ناول فیروز سنز لاہور سے ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے ہے۔ اس میں پاکستان بننے اور اس کے بعد مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے واقعات کو دردناک انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ بہاریوں کے مسئلے کو الطاف فاطمہ نے اندوہ ناک انداز میں پیش کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

> الطاف فاطمہ نے رومانی بنے بغیر زندگی کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ حقیقت نگاری کے ہر معیار پہ ناول پورا اترتا ہے۔ بیشتر خاتون ناول نگاروں میں جو ایک خاص نوع کی جذباتیت ملتی ہے۔ الطاف فاطمہ اس سے شعوری طور پر دامن بچاتی ہیں اور اسی لیے اچھا لکھ لیتی ہیں۔ [۳۲]

الطاف فاطمہ کا آخری ناول "خواب گر" ہے جو ۲۰۰۵ء میں فیروز سنز سے شائع ہوا۔ یہ ناول بلتیوں کے طرز زندگی کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ یہ ناول الطاف فاطمہ کا ایک منفرد تجربہ ہے۔

الطاف فاطمہ نے افسانہ نگاری کے علاوہ ترجمہ نگاری بھی کی۔ ترجمہ نگاری ایک مشکل فن ہے مگر چوں کہ الطاف فاطمہ کو انگریزی زبان پر عبور حاصل تھا لہٰذا جب ان کی ترجمہ نگاری پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ترجمہ کے لوازمات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اصل تحریر کی گہرائی میں داخل ہو کر ان کتب کا ترجمہ کیا ہے۔ انھوں نے پہلا ترجمہ ۱۹۶۰ء میں منظر عام پر آنے والی "ہارپر لی" کی کتاب To kill a mocking bird کا کیا۔ اس کا اردو ترجمہ "نغمے کا قتل" کے عنوان سے کیا گیا ہے۔ "بڑے آدمی اور ان کے نظریات" کے عنوان سے The genius of America :Men ideas shaped our civilization کا ترجمہ کیا۔ اسی ترجمے نے ادبی دنیا میں آپ کو بطور مترجم متعارف کروایا۔ جان سٹیک بیک (John Stenbeck) کے ناول Pearl کا اردو ترجمہ موتی کے نام سے کیا۔ ایلسا مارسٹن (Elsa Marston) کی کہانیوں Santa Claus in Baghdad) کا ترجمہ زیتون کے جھنڈ کے عنوان سے ہے۔ My children my gold کا ترجمہ "میرے بچے میری دولت" کے نام سے کیا گیا۔ رماہتہ کی " Inside the Haveli" کا اردو ترجمہ حویلی کے اندر کے عنوان سے ۱۹۹۹ء میں منظر عام پر آیا۔ سچ کہانیاں کے عنوان سے "Truth Tales" کا ترجمہ کیا گیا۔ Twentieth century : Japanese women writers short fiction کا ترجمہ جاپانی افسانہ نگار خواتین کے نام سے کیا گیا۔ علاوہ ازیں بڑی بی کا بچھڑا، مائی لارڈ کا حقہ، ایک تھالڑ کا، رات کا کھیل الطاف فاطمہ کے کیے گئے تراجم ہیں۔

الطاف فاطمہ نے ریڈیو کے لیے ڈرامے بھی لکھے۔ ان ڈراموں میں پختہ دیوار، کہکشاں کی دھول اور دھنک پر قدم شامل ہیں۔ علاوہ ازیں ان کا ناول دستک نہ دو بھی ڈرامائی شکل میں نشر ہوا۔ انھوں نے ایم اے میں مقالہ "اردو

ادب میں فن سوانح نگاری کی ابتدا" کے عنوان سے کیا۔اس کو تنقیدی کتاب کا درجہ حاصل ہے۔علاوہ ازیں انھوں نے "روزمرہ آداب" کے عنوان سے بھی ایک کتاب لکھی جو مکتبہ جدید لاہور سے ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی۔اس کتاب میں روزمرہ زندگی گزارنے کے آداب کو تحریر کیا گیا ہے۔ان کی تحریروں میں ادبی شان پورے جوبن کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ان کے ہاں فکری، فنی، اسلوبیاتی و موضوعاتی ہر حوالے سے غیر معمولی حسن اور دلکشی پائی جاتی ہے۔

الطاف فاطمہ کو بچپن میں پڑھنے لکھنے کا شوق نہ تھا بلکہ بچپن میں وہ کھیل کود میں مصروف رہتیں۔گلی ڈنڈا، پتنگ بازی، اچھل کود ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔پودوں کی دیکھ بھال اور جانوروں کو پالنے کا شوق تھا۔اس لیے وہ جانوروں کی عادات و خصائل کے حوالے سے کافی معلومات رکھتی تھیں۔ان کی والدہ گھر کے اندر کھیل کے مواقع مہیا کرتیں اور شطرنج، کیرم بورڈ اور تاش وغیرہ بڑے شوق سے کھیلتی تھیں۔ان کے ساتھ الطاف فاطمہ، ان کے بھائی بہن اور پڑوس کے بچے بھی ان کے ساتھ شریک رہتے۔الطاف فاطمہ بچپن میں خاموش طبیعت مگر شریر تھیں۔انھیں پڑھائی سے دلچسپی نہیں تھی۔مگر جوانی میں انھیں پڑھنے لکھنے کا شوق ہو گیا اور پھر وہ ہر وقت مطالعے میں مصروف رہتیں۔الطاف فاطمہ سے متعلق انتظار حسین لکھتے ہیں کہ:

> افسانے انھوں نے اپنے ماحول سے ہٹ کر آدمیوں کی دنیا کے لکھے ہیں۔باقی یہ کہ جانوروں سے انھیں دلچسپی تو ہے ہی بلکہ ایک زمانے تک وہ خود اس زمرے میں شمار ہوتی رہیں۔سب گھر والے انھیں گھوڑی کہتے تھے۔الطاف فاطمہ گھوڑی۔ الطاف فاطمہ گھوڑی بھی ایک ہڑونگی تھی، کبھی درخت پر چڑھی نظر آتی۔ کبھی گلی ڈنڈا کھیلتی دکھائی دیتی کبھی لکڑی کی تلوار بنا کر جنگ لڑ رہی ہے۔نہ پڑھنا نہ لکھنا، بس ڈنڈے بجانا اور کھیل کھیلنا اور کھیل بھی سب مردانے۔[۳۳]

الطاف فاطمہ بہت ہی خوددار خاتون تھیں۔وہ بہت سخت مزاج اور بارعب دکھائی دینے والی خاتون حقیقت میں انتہائی شفیق اور ہمدرد تھیں۔انھیں دنیاداری اور شہرت سے کوئی غرض نہ تھی۔وہ اپنا کام پوری محنت اور دلچسپی سے کرتی تھیں ان کی شخصیت کے حوالے سے سید مشہود رضوی کہتے ہیں:

> الطاف فاطمہ سے زیادہ درویش صفت انسان اور فنکار اب تک میری نظر سے نہیں گزرا۔یہ خاتون اپنی ذات اور فن کے معاملے میں حیرت انگیز حد تک بے نیاز ہیں۔[۳۴]

کنج گلی الطاف فاطمہ کے گھر کا نام ہے۔جہاں وہ اپنے ملازم غلام حسین اور اس کی بیٹی کے ساتھ رہتی تھیں۔ان کا ملازم بہت وفادار تھا۔الطاف فاطمہ نے شادی نہیں کی بلکہ تنہا مگر باوقار زندگی بسر کی۔وہ اپنی ذاتی زندگی اور معاملات پر کم ہی کسی سے بات کرتی تھیں۔اپنی تہذیب کا احترام ان کی شخصیت کا خاصا تھا۔ان کے بھتیجے کرنل ارسلان کا کہنا ہے کہ:

حقیقت تو اللہ پاک ہی بہتر جانتے ہیں مگر والد صاحب کے کہنے کے مطابق الطاف فاطمہ ایک رکھ رکھاؤ والی خوددار خاتون تھیں۔ ان میں انانیت اور حکمرانی کا عنصر بے حد پایا جاتا تھا جس کی بنیاد پر انھوں نے شادی سے انکار کر دیا۔ وہ مردوں کی حکمرانی اور برتری بھی تسلیم نہیں کرتی تھیں۔[۳۵]

ادبی دنیا کا درخشاں ستارہ الطاف فاطمہ ۲۹ نومبر ۲۰۱۸ء کو انتقال کر گئیں۔ بوقت وفات ان کی عمر تقریباً ۹۰ برس تھی۔ وہ اردو ادب کی اہم ترین ناول نگار، افسانہ نویس اور مترجم تھیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں اور تراجم سے ادب کو مالامال کیا۔ مگر ادب کی دنیا میں ان کی وہ قدر نہ کی گئی جس کی وہ حق دار تھیں۔ مستنصر حسین تارڑ ان کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں "زمانے نے ان کی قدر نہ کی تو انھوں نے بھی زمانے کو درخور اعتنانہ سمجھا کہ وہ کسی ایک زمانے کی نہیں بلکہ زمانوں کی ادیب تھیں۔"[۳۶] الطاف فاطمہ نے اپنے ناولوں میں ہجرت کے موضوعات کے ساتھ ساتھ تہذیب و روایات کو بھی موضوع بنایا۔ ان کے ناولوں میں ہجرت، رومانویت، ماضی کی طرف پلٹنا یہ تمام فنی لوازمات موجود ہیں۔ الطاف فاطمہ کے ناولوں اور افسانوں پر مختلف حوالوں سے کام ہو چکا ہے۔ اس مقالے میں الطاف فاطمہ کی ادبی شخصیت کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کے ناولوں کے مرد کرداروں کی تذکیری صفات و خصائص کا جائزہ لیا جائے گا۔ مجوزہ تحقیقی مقالے میں رابرٹ ووڈ کی تذکیریت کی تھیوری کو بطور نظریہ عملی اطلاق کیا جائے گا۔

حوالہ جات

۱. مولوی سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ (دہلی: نیشنل اکاڈمی انصار مارکیٹ دریا گنج، ۱۹۷۴)، ص ۵۹۹۔

۲. مولوی فیروزالدین، فیروز اللغات جامع (لاہور: فیروز سنز، س۔ن)، ص ۳۵۲۔

۳. مولوی نورالحسن نیئر، نور اللغات (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ زبان۔ ۱۹۹۸)، ص ۲۳۸۔

۴. https://www.lexico.com/definition/masculinity بتاریخ ۲۸ دسمبر ۲۰۲۱، بوقت ۴:۳۸۔

۵. https://www.merriam-webster.com/dictionary/masculinity بتاریخ ۲۸ دسمبر ۲۰۲۱، بوقت ۴:۴۱۔

۶. https://www.oxfordlearnersdictionaries.com/definition/english/masculinity بتاریخ ۲۸ دسمبر ۲۰۲۱، بوقت ۴:۴۵۔

۷. https://www.collinsdictionary.com/dictionary/english/masculinity بتاریخ ۲۸ دسمبر ۲۰۲۱، بوقت ۴:۴۸۔

۸. https://www.google.com/amp/s/dictionary.cambridge.org/amp/learner-english/masculinity بتاریخ ۲۸ دسمبر ۲۰۲۱، بوقت ۴:۵۱۔

۹. https://www.yourdictionary.com/masculinity بتاریخ ۲۸ دسمبر ۲۰۲۱، بوقت ۸:۵۳۔

۱۰. https://www.macmillandictionary.com/dictionary/british/masculinity بتاریخ ۲۸ دسمبر ۲۰۲۱، بوقت ۴:۵۶۔

۱۱. https://www.vocabulary.com/dictionary/masculinity بتاریخ ۲۸ دسمبر ۲۰۲۱، بوقت ۴:۵۰۔

۱۲. https://www.google.com/amp/s/www.urbandictionary.com/define.php%3fterm=masculinity&amp=true بتاریخ ۲۸ دسمبر ۲۰۲۱، بوقت ۵:۰۰۔

۱۳. https://www.sciencedirect.com/science/article/pii/S1877042815050909 بتاریخ ۱۵ دسمبر ۲۰۲۱، بوقت ۱۲:۳۲۔

۱۴. https://www.researchgate.net/publication/304125569_Gender_Roles_and_Society بتاریخ ۱۳ دسمبر ۲۰۲۱، بوقت ۱۱:۴۳۔

۱۵. https://www.researchgate.net/publication/304125569_Gender_Roles_and_Society بتاریخ ۱۳ دسمبر ۲۰۲۱، بوقت ۱۱:۴۳۔

۱۶. https://www.sciencedirect.com/science/article/pii/S1877042815050909 بتاریخ ۱۵ دسمبر ۲۰۲۱، بوقت ۱۲:۳۲۔

۱۷. ایضاً۔

۱۸. ایضاً۔

۱۹. https://us.sagepub.com/sites/default/files/upmassets/90223_book_item_902 23.pdf بتاریخ ستمبر ۲۰۲۱، بوقت: ۵:۲۸۔

۲۰. https://www.sciencedirect.com/science/article/pii/S1877042815050909 بتاریخ ۱۵ دسمبر ۲۰۲۱، بوقت ۱۲:۳۲۔

۲۱. ایضاً۔

۲۲. https://www.researchgate.net/publication/333406233_Concept_of_Masculinity_in_Men/link/5cec8361299bf109da750101/download بتاریخ ۱۷ دسمبر بوقت ۵:۲۱۔

۲۳. https://www.researchgate.net/publication/333406233_Concept_of_Masculinity_in_Men/link/5cec8361299bf109da750101/download بتاریخ ۱۷ دسمبر بوقت ۵:۲۱۔

۲۴. https://www.sciencedirect.com/science/article/pii/S1877042815050909 بتاریخ ۱۵ دسمبر ۲۰۲۱، بوقت ۱۲:۳۲۔

۲۵. حمیرا محمود، الطاف فاطمہ کی افسانہ نگاری (مقالہ برائے ایم ایس، دی گورنمنٹ صادق کالج وومن یونی ورسٹی بہاولپور، ۲۰۲۰ء)، ص ۴۔

۲۶. کائنات پروین، الطاف فاطمہ کے افسانوں میں ناسٹیلجیائی عناصر (مقالہ برائے ایم فل، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد)، ص ۴۱۔

۲۷. تسنیم آصف، الطاف فاطمہ کی ناول نگاری: فکری و فنی جائزہ (مقالہ برائے ایم فل، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد)، ص ۱۸۔

۲۸. ڈاکٹر نجمہ صدیق، پاکستانی خواتین کے رجحان ساز ناول (لاہور: اظہار سنز: ۲۰۰۸)، ص ۲۴۵۔۲۴۶۔

۲۹. حمیرا محمود، الطاف فاطمہ کی افسانہ نگاری، ص ۷۔

۳۰. .October20,2020-8:49PM-الطاف-فاطمہ-سے-ماہ-پارہ-صفدر-کی-گفتگو
http://samt.bazmeurdu.net/article/

۳۱. تسنیم آصف، الطاف فاطمہ کی ناول نگاری: فکری و فنی جائزہ، ص ۲۱۔

۳۲. حمیرا محمود، الطاف فاطمہ کی افسانہ نگاری، ص ۱۸۔

۳۳. تسنیم آصف، الطاف فاطمہ کی ناول نگاری: فکری و فنی جائزہ، ص ۱۴۔۱۵۔

۳۴. حمیرا محمود، الطاف فاطمہ کی افسانہ نگاری، ص ۱۳۔

۳۵. ایضاً، ص ۱۱۔

۳۶. مستنصر حسین تارڑ، "دستک نہ دو" الطاف فاطمہ۔۔۔ہزار داستان، اخبار: روزنامہ ایکسپریس، (۱۳ جنوری ۲۰۱۹)۔

باب دوم:

الطاف فاطمہ کے ناولوں اور مرد کرداروں کا پس منظری مطالعہ

باب دوم:

الطاف فاطمہ کے ناولوں اور مرد کرداروں کا پس منظری مطالعہ

ادب زندگی کا ترجمان ہے اور کہانی اس کا اہم پہلو ہے۔ ادب کے سفر کا آغاز افسانوی ادب کے زیر اثر ہوا کیوں کہ اس میں مرکزی کردار کہانی نے ادا کیا۔ ابتدائے زمانہ ہی سے انسان کو کہانی سننے اور سنانے کا شوق رہا ہے۔ لہٰذا قصہ گوئی کا فن تہذیب انسانی کے ساتھ ہی شروع ہوا۔ کہانی کا فن ہمیشہ سے عصری میلانات کا مرہون منت رہا ہے۔ آغاز سے اس وقت تک کہانی اپنے اسلوب بیان اور موضوعات کے حوالے سے کئی انداز تبدیل کر چکی ہے۔ عہد قدیم میں کہانی کی ابتدائی شکل داستان تھی۔ داستانیں تخیل اور طلسماتی فضا سے پُر ہوتیں اور ان میں مافوق الفطرت عناصر پائے جاتے ہیں۔ ان داستانوں کو ادبی، مذہبی اور تہذیبی دستاویزات سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ داستانوں کا ایک کثیر ذخیرہ اردو ادب میں موجود ہے۔ جیسے جیسے انسان ترقی کی راہ پر گامزن ہوا۔ زمینی فاصلوں میں کمی آئی تو ملکوں کے باہمی رابطے بڑھے۔ جس نے ایک دوسرے کی تہذیب کو متاثر کیا۔ برصغیر میں انگریزوں کی آمد نے ہندوستان کی تہذیب پر گہرے نقوش مرتب کیے جہاں تمام شعبہ ہائے زندگی متاثر ہوئے وہیں ادب نے بھی اثر قبول کیا۔ مغرب کے زیر اثر جن اصناف نے اردو میں شمولیت اختیار کی ان میں سے ایک صنف ناول ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ریاض ہمدانی لکھتے ہیں:

> برصغیر کا کہانی کار دراصل اپنے سماج کا انیسویں صدی کے آغاز میں لکھی گئی داستانوں کی مضبوط روایت جو تخیل کی مرہون منت تھی، سے نکالنے کا خواہاں تھا اور اسے بدلتے تناظر میں سوچنے کی طرف راغب کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ بات صرف سامراج کے تنخواہ دار طبقے نے اردو ناول کی صنف کی نشوونما کی طرف توجہ دی۔[1]

ناول زندگی کے حالات وواقعات کی ترجمانی کرتا ہے اور یہ کہانی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس نے اپنے اندر وہ سب کچھ سمو لیا ہے جس میں انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا مکمل شعور پایا جاتا ہے۔ زندگی کی قدریں ادب میں اس وقت اجاگر ہوں گی جب اس میں کسی خاص عہد سے تعلق رکھنے والے انسانوں کی نفسیاتی الجھنوں، سماجی مسائل،

احساسات و جذبات اور ان کی تہذیب و ثقافت کی نمائندگی کی جائے۔ بہترین ادب کی پہچان یہی ہے کہ وہ زندگی کے ساتھ پیوست ہو۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ناول کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ناول وہ قصہ یا کہانی ہے جس کا موضوع انسانی زندگی ہو اور ناول نگار زندگی کے مختلف پہلوؤں کا مکمل اور گہرا مشاہدہ کرنے کے بعد ایک خاص سلیقے اور ترتیب کے ساتھ اپنے تجربات و مشاہدات کو کہانی کی شکل میں پیش کر دے۔ ناول میں حقیقت نگاری بنیادی چیز ہے۔ فرضی، خیالی اور مافوق الفطرت باتوں سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ دراصل ناول داستان کی ارتقائی شکل ہے۔[۲]

ناول کے اجزائے ترکیبی:

کہانی ناول کا اہم جز ہے۔ کہانی کی عدم موجودگی کے سبب ناول میں دلچسپی پیدا نہیں ہو پاتی۔ ناول نگار حقیقی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔ اسی لیے کہانی کا دارومدار ناول نگار کی ذہنی استعداد پر ہے۔ اگر ناول نگار زندگی کا گہرا اور وسیع مشاہدہ رکھتا ہے اور اپنے عہد کے مختلف قسم کے تجربات کو فنی سلیقے سے بیان کرنے کی مہارت رکھتا ہے تو وہ یقینا ایک بہترین ناول تخلیق کر سکتا ہے۔ ناول نگار کو چاہیئے کہ وہ کہانی کو اس طرح بیان کرے کہ آغاز سے انجام تک کہانی میں دلچسپی اور تجسس قائم رہے۔ اس حوالے سے عظیم الشان صدیقی لکھتے ہیں:

> کہانی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ سامعین یا قاری کے اس ذوق تجسس کو برقرار رکھے۔ اور وہ ہر لمحہ یہ معلوم کرنے کے لیے بے قرار ہے کہ پھر کیا ہوا۔ یہ سوال جس قدر شدید ہو گا اس قدر کہانی زیادہ کامیاب کہلائے گی اور اگر اس جذبہ کو ابھارنے میں ناکام رہی تو وہ کہانی کی سب سے بڑی خامی ہو گی۔[۳]

ناول کا دارومدار کہانی پر ہوتا ہے۔ اس لیے کہانی کو شروع سے ہی ترتیب دے دینا چاہیے۔ کہانی کو ترتیب دینے کے لیے اہم جزو پلاٹ ہے۔ پلاٹ کو ناول کی روح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ ناول کا وہ حصہ ہوتا ہے جس میں کہانی کے واقعات کو ترتیب وار پیش کیا جاتا ہے تاکہ کہانی میں باہمی ربط موجود رہے۔ ناول کی کامیابی کا راز خوب صورت پلاٹ کی تشکیل و تعمیر میں پوشیدہ ہے۔ بہترین اور خوب صورت پلاٹ کے لیے ناول نگار میں تکنیکی صلاحیت کا ہونا ضروری ہے۔ پلاٹ فنی ہنر مندی اور فکری بصیرت کے ذریعے تشکیل کرنا چاہیے تاکہ زندگی کے منتشر واقعات و لمحات کو اپنی گرفت میں لیا جا سکے۔ پلاٹ کے متعلق ڈاکٹر اسلم آزاد لکھتے ہیں:

TH 25429

خوب صورت پلاٹ کی تشکیل کے لیے تکنیکی ہنر مندی اور مشاقی بے حد ضروری ہے پلاٹ تخلیقی بصیرت سے زیادہ فنی ریاضت چاہتا ہے۔ اکتساب و ریاضت ہی کے ذریعے بہتر پلاٹ بنانے کے فن پر قدرت حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس کے لیے تخیل، ذہانت اور حافظے کے عناصر کی بھی خاص طور پر اہمیت ہے۔ ناول نگار انھیں قوتوں کے سہارے ایک اچھے، خوب صورت اور اثر انگیز پلاٹ کی تشکیل میں کامیابی حاصل کرتا ہے۔[۴]

ناول میں دنیا کے تجربات وواقعات بیان کیے جاتے ہیں۔ اس کو بیان کرنے میں ایک ایسی کہانی کا ہونا ضروری ہے جو قاری کو متوجہ رکھ سکے۔ کہانی میں واقعات کا تسلسل کبھی ٹوٹنا نہیں چاہیے۔ جتنے اچھے انداز میں کہانی باہم مربوط ہو۔ تبھی قصہ اتنا دلچسپ ہو گا۔ ناول کا پلاٹ کہانی کی ترتیب سے خاص تعلق رکھتا ہے۔ واقعات کا ابتدا سے انجام تک پہنچنا اور اس کے بعد مؤثر طریقے سے اس کا ختم ہونا، اس ترتیب و تنظیم اور مربوط انداز کا نام پلاٹ ہے۔ مضبوط پلاٹ کے لیے تکنیکی ہنر مندی ضروری ہے۔ اس کے ساتھ پلاٹ میں لچک ہونی چاہیے۔ انسان کے کردار کی نفسیاتی گرہیں اور اسرار کھولنا ہی ناول کا مقصد ہے۔ زندہ و جاوید کرداروں کی تخلیق ہی ناول کا مقصد ہے اس کے لیے ناول نگار کا مشاہدہ وسیع ہونا چاہیے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ وہ ایسے کرداروں کی تخلیق کرے جن کے بارے میں اس کا مشاہدہ اور وژن وسیع ہو۔ اس کی معلومات عمدہ ہوں۔

ناول کے پلاٹ کو واقعات اور کرداروں کے ذریعے ہی ترتیب دیا جاتا ہے۔ کردار کے بغیر کہانی مکمل نہیں ہو سکتی کیوں کہ کردار سے ہی کہانی جنم لیتی ہے۔ ناول کی کامیابی کا دارومدار اس کی کردار نگاری پر ہے۔ ناول حقیقی زندگی کی عکاسی کرتا ہے اس لیے ناول کے کردار بھی حقیقی انسانوں سے ملتے جلتے ہیں۔ ایسے ہی کرداروں کو قاری پسند کرتا ہے۔ اجنبی اور غیر حقیقی کردار کبھی دلچسپی کا باعث نہیں ہو سکتے۔ کردار مادی زندگی سے جتنے زیادہ نزدیک ہوں گے ناول میں پیش کردہ زندگی اُتنی ہی پر کشش اور اثر انگیز ہو گی۔ جدید دور میں واقعات سے زیادہ کرداروں، ان کے ذہنی اور نفسیاتی ارتقا کی طرف زیادہ توجہ دی جانی لگی ہے۔ ناول کے کردار اپنی تمام بشری خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں۔ کردار کی بنیادی طور پر دو اقسام ہیں۔ ایک قسم ٹائپ یا جامد کردار کی ہوتی ہے۔ یہ کردار شروع سے آخر تک ایک ہی طرح سے رہتے ہیں۔ یہ کردار جمود کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ کردار کسی خاص سانچے میں ڈھل جانے کے بعد اس قدر پختہ ہو جاتے ہیں کہ کسی تبدیلی کو قبول کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ دوسری قسم مکمل یا پہلو دار کردار کی ہوتی ہے۔ یہ کردار وقت و حالات کے مطابق اپنی شخصیت کو تبدیل کر لیتے ہیں۔ یہ متحرک کردار ہوتے ہیں۔ ان میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ یہ قاری کو اپنی شخصیت کی وجہ سے تجسس میں مبتلا رکھتے ہیں۔ کرداروں کے متعلق سہیل بخاری لکھتے ہیں:

جس ناول کے کردار زندگی کے جیتے جاگتے نمونے ہوتے ہیں وہی کامیاب رہتا ہے چوں کہ ہر انسان خود ارادیت کا مالک ہوتا ہے، لہٰذا اس کے نمونوں کے طرز عمل میں آزادی کی شرط لازمی ہے۔ جس قصے کے کردار محض مصنف کے اشاروں پر ناچتے ہیں وہ خشک اور غیر دلچسپ ہو جاتا ہے۔[۵]

ناول میں کردار اپنے زمانے اور اپنے طرز معاشرت کی عکاسی کرتے ہیں۔ ناول میں زمان و مکان کی ذیل میں ایک پس منظر ہوتا ہے۔ جو ناول کا ایک ناگزیر جزو ہے۔ کہانی کے تمام واقعات کسی خاص مقام پر عمل میں آتے ہیں اور کردار بھی انھیں مخصوص جگہوں پر اپنے افعال و اعمال کے ذریعے اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ جو اس عہد کی طرز معاشرت کے ساتھ ساتھ سماجی صورت حال کو بھی پیش کرتے ہیں۔ اگر ناول کے کرداروں اور واقعات کا عہد اور مقام متعین نہ ہو تو معاشرے کی عکاسی ناممکن ہے۔ ناول کے کردار اور واقعات معاشرے سے ہی اخذ کیے گئے ہوتے ہیں اور ناول نگار انھیں کرداروں اور واقعات کے ذریعے سے اس دور کی عکاسی کرتا ہے۔ چوں کہ ہر عہد دوسرے عہد سے اور ہر مقام دوسرے مقام سے مختلف ہوتا ہے اس لیے اس کے کردار بھی اسی پس منظر میں اپنے عہد اور طرز معاشرت کی عکاسی کرتے ہیں۔ پس منظر کے متعلق ڈاکٹر یٰسین لکھتے ہیں:

پس منظر جانی پہچانی جگہ اور جغرافیائی اکائی ہے جہاں انسان ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور ان کے باہمی رشتوں سے کہانی کا تانا بانا تیار کیا جاتا ہے۔ ایک حد تک انھیں حدود میں رہ کر کہانی کی سمت متعین کی جاتی ہے۔ "مقام" وہ جگہ ہے جہاں مصنف کی اپنی جڑیں موجود ہیں اور جہاں وہ زمیں پر کھڑا ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ "مقام" یا پس منظر کے توسط سے اپنا زاویہ نگاہ اور فلسفہ حیات مرتب کرتا ہے۔[۶]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام واقعات اپنا زمانی اور عصری پس منظر رکھتے ہیں۔ کرداروں کے ارتقا کے لیے ماحول کی پیش کش بھی اہمیت رکھتی ہے۔ واقعات اور کرداروں کے توسط سے ناول نگار ایک خاص سماج کو خاص عہد کے تناظر میں پیش کرتا ہے۔ ناول نگار کو چاہیے کہ ان کی پیش کش ایسے کرے کہ کردار اپنے مخصوص ماحول کی پیداوار اور کائنات کا حصہ معلوم ہوں اور زندگی کو نمایاں کریں۔ بہر حال کردار قصے کو بڑھانے کا سبب ہیں۔

ناول نگار ناول میں اپنے نقطہ نظر کو پیش کرتا ہے لیکن اس کا اظہار فنی سلیقے کا تقاضا کرتا ہے۔ ناول نگار ناول میں اپنے خیالات کی ترجمانی کرداروں کے وسیلے سے کرتا ہے در حقیقت یہ ایک شعوری کاوش ہوتی ہے مگر اس کے لیے یہ لازمی ہے کہ یہ غیر شعوری معلوم ہوں۔ نقطہ نظر ناول نگار کی بصیرت کی گہرائی کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے پس منظر میں ناول نگار کا علم، تجربہ اور مشاہدہ ہوتا ہے۔ ایک بڑا فن کار زندگی کے حقائق کو اپنی بصیرت سے جانچتا ہے اور پھر

اسے واقعات و جزئیات کے وسیلے سے پیش کرتا ہے۔ وہ اس دور کے معائب و محاسن کو غیر شعوری طور پر بیان کرتا ہے۔ ناول حقیقی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس لیے ناول نگار کے لیے بھی یہ لازمی ہے کہ وہ حقیقی زندگی کی ترجمانی کرے۔ ڈاکٹر اسلم آزاد لکھتے ہیں:

> ناول میں زندگی کی تخلیق کچھ اس ڈھنگ سے ہوتی ہے کہ نقطہ نظر خود بخود نمایاں ہو جاتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ناول میں زندگی کی تخلیق و تشکیل کسی نقطہ نظر کے بغیر ہو۔ کیوں کہ تجربوں ،مشاہدوں اور مطالعوں کی بنیاد پر ناول نگار زندگی کے بارے میں اپنی کوئی نہ کوئی رائے بنالیتا ہے، کوئی نہ کوئی خیال اور تصور قائم کرلیتا ہے اور اسے ناول کے فنی تقاضوں میں جذب کر کے پیش کرتا ہے۔ اس کا یہ نقطہ نظر صرف مسائل حیات کی عکاسی نہیں کرتا بلکہ انسانی رابطوں ،سماجی رشتوں اور معاشرتی پہلوؤں کی نئی جہت اور نئی معنویت تلاش کرتا ہے۔[۷]

ناول نگار کسی نہ کسی دنیاوی نکتے کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنا ناول تحریر کرتا ہے۔ نقطۂ نظر ناول نگار کے مشاہدے کی گہرائی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس مشاہدے کے پیچھے اس کا علم، تجربہ اور مطالعہ ہوتا ہے۔ جسے پڑھ کر قاری کا ذہن ضرور کسی نہ کسی انجام پر پہنچتا ہے۔ ایک بڑا ناول نگار زندگی کی حقائق کو قصے، واقعات اور جزئیات کے ذریعے بیان کرتا ہے اور ہم عصر عہد میں اپنے سماجی عیوب و خصائص کو ارادی طور پر پیش کرتا ہے۔

ناول کے واقعات اور کرداروں کی پیشکش کا وسیلہ مصنف کا اسلوب ہے۔ ناول میں پیش کردہ مکالمے صرف جذبات و خیالات کا اظہار ہی نہیں کرتے بلکہ کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ناول نگار اپنی زبان و بیان کے ذریعے کرداروں کی ذہنی اور سماجی حیثیت کو بیان کرتا ہے۔ کردار کو زندہ رکھنے میں اسلوب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ زبان سادہ ہو یا پر پیچ اس میں دلچسپی اور رنگینی کا عنصر موجود ہونا چاہیے۔ جس سے کردار اور صورت حال کی عکاسی پر اثر انداز میں سامنے آسکے۔ زبان سادہ، شستہ، رواں اور موضوع کے ساتھ پورے طور پر ہم آہنگ ہونی چاہیے اور کردار کی خصوصیات کو مد نظر رکھتے ہوئے لکھنی چاہیے۔

ناول کی تشکیل ان اجزاے ترکیبی کے ذریعے ہوتی ہے۔ انگریزی کے ناول "پامیلا" کو پہلا ناول مانا جاتا ہے۔ اردو ناول نگاری کا آغاز معاشرتی و سماجی تبدیلیوں سے ہوتا ہے۔ ناول حقیقی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ اس مادی دنیا کے تجربات کی پیش کش ہی دراصل تکنیکی طور پر ناول کو ناول بناتی ہے۔ ناول بنیادی طور پر ایسی صنف ہے جو سماجی تبدیلیوں سے براہِ راست رابطہ رکھتی ہے۔ ناول کے فن کا سیدھا سادہ تقاضا یہ ہے کہ اس کے ذریعے زندگی کے مسائل کو پیش کیا جائے۔ ناول نگار اپنے زمانے کے حالات اور سماجی زندگی کی تمام رعنائیوں اور خامیوں کا بغور مشاہدہ کرتا ہے اور معاصر عہد کے مختلف انسانی مشاہدات کو ایک فنی سلیقے سے بیان کرتا ہے۔

ناول ایک تخلیقی فن ہے ناول نگار ناول پر ہر زاویے سے نظر ڈالتا ہے اور اس کے مواد کو ترتیب دینے کے لیے فنی پہلوؤں کو مد نظر رکھتا ہے۔ یہ ناول کو ہی امتیاز حاصل ہے کہ وہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ ناول میں کبھی اصلاحی موضوع کو پیش کیا جاتا ہے تو کبھی کسی کردار کے ذہنی رجحانات کے ذریعے کسی پورے معاشرے کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ تاریخی اور سیاسی پس منظر میں قومی شعور پیدا کیا جاتا ہے۔ غرض ناول میں زندگی کے تمام موضوعات کو پیش کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ ناول میں انسانی زندگی کے حقیقی تجربات کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ ہر اچھے ناول کی خوبی یہ ہے کہ پڑھنے والا محسوس کرے کہ جیسے ڈراما دیکھا یا جارہا ہو۔ اردو ناول میں زندگی کے تمام موضوعات کو پیش کیا گیا ہے۔ اردو ناول کی ابتدا میں اصلاحی ناول لکھے گئے۔ پہلے ناول لکھنے والے ڈپٹی نذیر احمد تھے۔ بیسویں صدی کے انقلابات بھی اردو ناول پر اثر انداز ہوئے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے طبقاتی کشمکش کو فروغ دیا لہٰذا سماجی سطح پر اردو نے نئے موضوعات کو قبول کیا۔ تقسیم ہند یعنی ۱۹۴۷ء کے بعد ہجرت جیسا کرب ناک موضوع ناولوں کا حصہ بنا۔ اس ناول پر بہت سے ناول نگاروں نے اپنا قلم اٹھایا۔ جن میں قراۃ العین حیدر، شوکت صدیقی، عبداللہ حسین، خدیجہ مستور، انتظار حسین اور الطاف فاطمہ شامل ہیں۔ الطاف فاطمہ کے ناولوں میں فسادات، تقسیم ہند اور ہجرت کے اثرات واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے نفسیاتی الجھنوں، طبقاتی کشمکش، تہذیب واقدار کی شکست وریخت کو بھی اپنے ناولوں میں بیان کیا۔ اس باب میں الطاف فاطمہ کے ناولوں کا پس منظری مطالعہ کیا جائے گا۔ الطاف فاطمہ کے کُل چار ناول ہیں۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز تعلیم کے دوران ہی کیا اور ایسے ناول لکھے کہ ان کو پذیرائی حاصل ہوئی۔

نشان محفل:

نشان محفل الطاف فاطمہ کا پہلا ناول ہے۔ یہ ناول انھوں نے دور طالب علمی میں ہی لکھا اور اسے بہت پذیرائی بھی حاصل ہوئی۔ یہ ایک ضخیم ناول ہے۔ جو ۱۹۶۰ء میں مکتبہ دانیال لاہور سے شائع ہوا۔ اس ناول میں الطاف فاطمہ نے مشرق اور مغرب کے مابین تہذیبی فرق کو دکھایا ہے نیز ناول کی کہانی کے واقعات کو قیام پاکستان سے جوڑ کر ہجرت کے موضوع کو بھی بیان کیا ہے۔ "نشان محفل" کے حوالے سے ڈاکٹر سلطانہ بخش لکھتی ہیں:

> نشان محفل میں الطاف فاطمہ نے مغربی ماحول میں پرورش پانے والی لڑکیوں کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ اس ناول کے پس منظر میں مصنفہ نے ہندو مسلم اور انگریز تکون میں ان کے

تعلقات اور برصغیر کی تقسیم میں انگریزوں کے کردار پر روشنی ڈالی ہے۔ مجموعی طور پر ناول دلچسپ اور قصہ گوئی کے عناصر کا حامل ہے۔[8]

ناول کی کہانی لکھنؤ سے تعلق رکھنے والے سید نادر حسین کے سفید پوش گھرانے کے گرد گھومتی ہے۔ نادر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان جاتا ہے جہاں وہ اپنے دوست بوب کی بہن روبینا سے نتائج کے حوالے سے سوچے سمجھے بغیر شادی کر لیتا ہے۔ روبینا تخیلاتی دنیا میں رہنے والی لڑکی ہے۔ اس نے اپنے ایک رشتہ دار انکل اینڈی سے ہندوستان کے متعلق بہت کچھ سن رکھا ہے۔ اس کی باتوں سے وہ اندازہ لگاتی ہے کہ ہندوستان چوں کہ ان کا محکوم ملک ہے اس لیے وہاں آقاؤں کے لیے بہت عیش کی زندگی ہے۔ لہٰذا جب وہ نادر کو دیکھتی ہے تو وہ اسے اپنے خوابوں کا شہزادہ لگتا ہے اور وہ اس سے شادی کر کے ہندوستان آجاتی ہے۔ یہاں نادر اور اس کے گھر والے روبینا کو ہر سہولت مہیا کرتے ہیں اس کے باوجود اس کی بے چین فطرت کو سکون نہیں ملتا۔ اسے یہاں اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ممتاز احمد لکھتے ہیں:

> نشان محفل میں ایک انگریز لڑکی کا المیہ بتایا گیا ہے جو فطری طور پر بے قرار اور بے چین ہے۔ ناآسودگی اس کا مقدر ہے۔ اسے مشرق پسند ہے۔ سو وہ نادر سے شادی کر کے ہندوستان آجاتی ہے۔ پہلے وہ یورپی زندگی سے غیر مطمئن تھی اور اب وہ مشرق سے نالاں ہو جاتی ہے۔[9]

روبینا اور نادر کے مزاجوں اور تہذیبی فرق کی وجہ سے ان دونوں کی زندگی سکون سے خالی رہی۔ الطاف فاطمہ نے ناول میں دونوں تہذیبوں کے فرق کو اس کے باشندوں کی نفسیات، اس کے طرز زندگی اور ذہنیت کے ذریعے بیان کیا ہے۔ نادر کے گھرانے کو دیکھا جائے تو ان کی زندگی، ان کا رہن سہن، طور اطوار ان کی تہذیب کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ ان کا رہن سہن ملاحظہ ہو:

> تختوں کے نیچے سے چوکے پر سفید براق سی چاندی بچھی ہوئی۔ سرخ رنگ کا قدرے گھسا ہوا نمدا، سلیقہ سے لگا ہوا گاؤ تکیہ اور پاس یہ بی اماں کی جھم جھم کرتی پٹاری اور دوسرے کونے پر جانماز رکھی ہوئی۔ ایک طرف بی اماں بیٹھی ہوتیں، سامنے ٹوکری میں تازہ تازہ ترکاری رکھے بڑے اہتمام سے ساگ چن چن کر کترتی یا مٹر چھیلتی۔[10]

اس اقتباس سے ان کے رہن سہن کا طریقہ واضح ہوتا ہے۔ نادر، رابعہ اور روبینا جب اویناش کی دعوت پر تاج محل کی سیر کو جاتے ہیں تو اس وقت بی اماں کا نادر اور روبینا کو قرآن پاک کی ہوا دے کر اس کے نیچے سے نکالنا، رابعہ پر دعائیں پڑھ کر دم کرنا یہ تمام طریقے ان کی تہذیب کی آئینہ دار ہیں۔ رشتوں سے محبت اور ان کا لحاظ ان

کی تہذیب ،روایات اور اقدار کی عکاسی کرتا ہے۔ دوسری جانب روبینا کا کلب میں جانا، دوسرے مردوں کے ساتھ ڈانس کرنا، ان کے ساتھ دوستی بڑھانا، راتوں کو دیر تک باہر رہنا، شراب نوشی اور سیگریٹ پینا، تمام رشتوں سے اکتاہٹ، لوگوں کو اپنے سے حقیر جاننا یہ تمام تر اطوار مغربی تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں۔

قیام پاکستان الطاف فاطمہ کی زندگی میں پیش آنے والا بہت بڑا واقعہ ہے۔ وہ اپنے ناولوں میں قیام پاکستان کے وقت ہونے والے فسادات ،ہجرت ،رشتوں اور انسانی اقدار کی شکست وریخت کو بیان کرتی ہیں۔ ہندوستان کی تقسیم برصغیر کی تاریخ کا بہت اہم واقعہ ہے۔ دو قومی نظریے کی بنیاد پر اس کی تقسیم ہوئی۔ ہندوستان میں دو قومیتیں آباد تھیں۔ ہندو اور مسلم۔ ان دونوں میں کوئی بھی قدر مشترک نہ تھی۔ جس کی وجہ سے ۱۹۴۷ کو پاکستان وجود میں آیا۔ اس موقع پر بے شمار لوگوں کو ہجرت و فسادات کا سامنا کرنا پڑا۔ مذہب کی بنیاد پر لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے۔ برسوں سے ایک ساتھ رہنے والے ہندو مسلم ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوئے۔ عورتوں کی عصمت دری کی گئی، بچوں کو نیزوں پر اچھالا گیا اور زندہ جلایا گیا، لوگوں کے گھروں کو نذر آتش کیا گیا۔ تقسیم نے اخوت، محبت اور انسانیت کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ قتل وغارت گری کا بازار گرم ہوگیا۔ غرض انسان نے درندے کا روپ دھار لیا۔ دشمنی اور رقابت نے انسانوں کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کر لی۔ ان فسادات میں لاکھوں مسلمانوں کو ہجرت کر کے پاکستان جانا پڑا۔ اسی طرح ہندوؤں کو جو کئی سالوں سے ان علاقوں میں آباد تھے اپنا گھر بار چھوڑ کر بھارت جانا پڑا۔ تقسیم ہند کی ہجرت کو تاریخ میں سب سے بڑی ہجرت کا نام دیا جاتا ہے۔ نشان محفل میں الطاف فاطمہ نے ایبک اور روبینا کے کرداروں کے ذریعے مہاجرین کی صورت حال کو بیان کیا ہے۔ ایبک اور روبینا بے سروسامانی کی حالت میں مہاجر کیمپ میں پناہ لیتے ہیں۔ جہاں انھیں کھانے کا سامان بھی مشکل سے ملتا۔ سردی میں بچوں سمیت بغیر بستر کے کئی راتیں گزارنی پڑتی ہیں۔ ان حالات میں روبینا کو اپنے بیٹے محمود کے بچھڑ جانے کا بھی غم تھا۔ جو مسوری کے کانوینٹ سکول کے ہاسٹل میں تھا۔ وہاں بھی فسادات شروع ہوگئے اور سکول والوں نے فسادات کے سبب ان بچوں کو ٹرین میں بٹھا کر بے یارومددگار چھوڑ دیا۔ ہر روز ریڈیو پر کئی نام نشر کیے جاتے جس سے لوگوں کو اپنے پیاروں کے بارے میں معلوم ہوتا۔ مگر روبینا کو بینا کے خط سے محمود کی اطلاع مل جاتی ہے۔ محمود اپنی ماں کے پاس آکر وہاں کے حالات کا ذکر کرتا ہے:

> تمہاری مدر نے تم لوگوں کو اس طرح بے سروسامان کیوں بھیج دیا۔ وہاں تم لوگ زیادہ محفوظ تھے۔ محمود کہتا ہے: وہ کیا کرتیں ہندو وہاں گھس آئے تھے، انھوں نے کئی بچے مار دیے تھے۔[11]

اس اقتباس سے فسادات کی صورت حال واضح ہوتی ہے کہ سکول تک بھی فسادات کا شکار تھے۔ معصوم بچوں کی جانیں ان فسادات کی نذر ہوئیں۔ چوں کہ فسادات اور ہجرت انسانی زندگی کی پامالی اور بربادی کا تجربہ ہے اس میں انسان کا اپنی حیثیت سے گر جانے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو خانزادہ گل نواز کا کردار ایسا ہی ہے۔ تقسیم سے پہلے خانزادہ گل نواز بڑی شان سے سنوگ میں واقع خوب صورت کاٹیج میں رہتے تھے مگر تقسیم ان کے حالات پر بھی اثر انداز ہوئی۔ ان کا مکان کسٹوڈین کے قبضہ میں چلا گیا۔ گھر کے آدھے حصے میں شرنارتھی آکر آباد ہو گئے۔ ان کا کاروبار ختم ہو گیا اور وہ گھر کے دو کمروں تک محدود ہو کر رہ گئے۔ اپنے مقام کو کھو کر زندگی گزارنا انتہائی دشوار گزار مرحلہ ہے مگر تقسیم کے بعد بہت سے گھرانوں کو اس تلخ حقیقت کو برداشت کرنا پڑا۔ الطاف فاطمہ نے اس کردار کے ذریعے سے اس حقیقت پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے نہ صرف مسلمانوں کی مشکلات کو بیان کیا ہے بلکہ غیر جانبداری کا ثبوت دیتے ہوئے ہندوؤں اور سکھوں پر بھی ہجرت کے اثرات کو دکھایا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ شملہ میں ایبک کو دیکھ کر پاکستان سے ہندوستان ہجرت کر کے جانے والے سردار جی وطن کی یاد میں کھو گئے۔ اس حوالے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> بس پھر کیا تھا غیرت کے تمام پردے درمیان سے اٹھ چکے تھے۔ ان کا دل چاہا لپک کر اس شخص کو گلے سے لگائیں اس کی آنکھوں کو چوم لیں۔ جنھوں نے چند دن پہلے لاہور کی سڑکوں اور گلیوں کو دیکھا تھا۔ وہ جم کر بیٹھ گئے۔ جو گیا رنگ کی پگڑی اور بڑے سمارٹ سوٹ میں وہ اب تک لاہوریے ہی نظر آرہے تھے۔ پھر اب نہایت فصیح و بلیغ پنجابی میں شاہی مسجد سے لے کر ہیرا منڈی تک کی خیریت پوچھ رہے تھے۔ انھوں نے یہ نہ پوچھا کہ وہاں کی اقتصادی اور سیاسی حالت کیا ہے اور کس منزل میں ہے۔ وہ تو بس جی جان سے لارنس کی بہاروں بیڈن روڈ تلی مچھلی اور راوی کے کناروں کی باتیں کر رہے تھے۔ اس آبشاروں اور سرو شمن کی دنیا میں بیٹھ کر انھیں لوہاری اور بھاٹی کی یاد ستا رہی تھی۔ [۱۲]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہجرت نے نہ صرف مسلمانوں کو مشکلات سے دوچار کیا بلکہ اس کا اثر ہندوؤں اور سکھوں پر بھی پڑا جنھوں نے اپنے علاقوں کو خیر آباد کہا۔ انھیں وطن کی یاد ستاتی ہے۔ الطاف فاطمہ نے اپنے ناول میں اس حوالے سے بالکل غیر جانبداری کا ثبوت دیا ہے۔ یہی ان کے ناول نگاری کی خاصیت ہے کہ وہ کسی پروپیگنڈے کی ترویج نہیں کرتیں۔

اس ناول کے مرد کردار درج ذیل ہیں:

۱۔سید نادر حسین کا تعلق لکھنؤ سے ہے۔یہ فنون لطیفہ کا طالب علم ہے۔اس نے انگلستان سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔لکھنؤ کالج میں پروفیسر کے طور پر ملازمت کرتا ہے۔یہ نہایت مہذب اور شریف انسان ہے۔تہذیب وروایات کا پاس دار اور امین ہے۔اس کردار میں دوسروں کی خاطر جینے کا جذبہ موجود ہے۔اس نے ایک انگریز لڑکی روبینا سے شادی کی اور ہر ممکن کوشش کی کہ وہ اسے زندگی کی تمام سہولیات میسر کرے۔مگر اس کی بیوی اس کے ساتھ بے وفائی کرتی ہے۔جس سے وہ دل برداشتہ ہو کر اسے طلاق دے دیتا ہے۔

۲۔ایبک نادر کا شاگرد ہے۔یہ لاابالی اورآزاد منش شخص ہے۔یہ پٹھان ہے مگر اس کا مزاج پٹھانوں سے مطابقت نہیں رکھتا۔اسے اشتعال انگیزی پسند نہیں ہے۔اس وجہ سے وہ اپنا آبائی علاقہ چھوڑ کر پڑھائی کی خاطر الٰہ آباد آجاتا ہے۔ایبک کے کردار میں ماں باپ کی محبت سے محرومی کا احساس پایا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ اس محبت کی تلاش میں غلط فیصلے کرتا ہے۔ایبک اپنے استاد نادر کی بیوی روبینا کے ساتھ محبت کر کے اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچاتا ہے اور اس گھرانے کی تباہی اور بربادی کا موجب بنتا ہے۔

۳۔خانزادہ گل نواز ایبک کے ماموں ہیں۔یہ ایک مہذب اور اصول پرست انسان ہیں۔یہ شملہ کے نواحی علاقے سنو گ کے ایک خوب صورت کاٹیج میں بے فکری کی زندگی بسر کرتے ہیں۔کتوں کو پالنا ان کا شوق بھی ہے اور کاروبار بھی۔یہ ایک معاملہ فہم شخص ہیں جب انھیں نادر کی بیوی روبینا اور ایبک کی محبت کے معاملے کا اندازہ ہوتا ہے تو یہ ایبک کو مؤثر انداز میں سمجھاتے ہیں کہ وہ اس معاملے میں یکسوئی اختیار کرے۔کیوں کہ اس کے مقابل ایک نہایت شریف اور بلند کردار کا حامل شخص ہے۔خانزادہ گل نواز کو نادر سے جذباتی لگاؤ ہے وہ نہیں چاہتے کہ ایبک اس شریف آدمی کو کسی قسم کا نقصان پہنچائے۔قیام پاکستان کے بعد خانزادہ ہندوستان میں ہی مقیم رہے مگر ان کے حالات بدل گئے۔ان کی شان وشوکت باقی نہ رہی۔وہ اپنے ہی گھر کے دو کمروں تک محدود ہو کر رہ گئے۔مگر وہ اتنے ضدی تھے کہ انھوں نے اپنا گھر چھوڑ کر پاکستان ہجرت نہ کی۔

۴۔محمود نادر کا بیٹا ہے۔ماں باپ، پھوپھی اور دادی کا دلارا بچہ ہے۔مگر حالات کی ستم ظریفی دیکھیے ماں باپ کی علیحدگی کی وجہ سے اس نے بچپن ہی سے بہت مشکلات کا سامنا کیا۔نادر اسے مسوری کے کانونٹ سکول میں داخل کروا دیتا ہے۔جہاں وہ بہت ترقی کرتا ہے مگر قیام پاکستان کی بدولت سکول والے اسے پاکستان روانہ کر دیتے ہیں۔جہاں وہ ایبک اور روبینا کے ساتھ رہتا ہے۔وہ ایک نہایت صابر اور حلیم لڑکا ہے۔وہ اپنے سوتیلے بہن بھائیوں کا خیال رکھتا ہے

اور ماں سے کسی قسم کی شکایت نہیں کرتا۔ وہ پڑھ لکھ کر نیوی کی انجینئرنگ لائن میں ملازمت حاصل کر لیتا ہے۔ محمود کے کردار کے ذریعے ایک یتیم بچے کی مشکلات کی واضح تصویر کشی کی گئی ہے۔

۵۔ اویناش نادر کا دوست ہے۔ یہ ایک خوش مزاج اور جاذب شخصیت کا مالک ہے۔ اس کی گفتگو کے انداز میں مسخرا پن ہے جس کی وجہ سے قاری محظوظ ہوتا ہے۔ یہ بینا سے محبت کرتا ہے مگر اس کی محبت میں خود غرضی نہیں پائی جاتی۔ یہ جانتا ہے کہ بینا نادر سے محبت کرتی ہے۔ جب یہ دونوں اپنے ہنی مون سے واپس آتے ہیں تو انھیں خط کے ذریعے نادر کی طبیعت کا معلوم ہوتا ہے۔ اویناش میں نادر کے حوالے سے رقابت کا جذبہ موجود نہیں ہے۔ اسے اپنے دوستوں سے محبت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کی بیماری کا سن کر بینا کو نادر کے پاس روانہ کرتا ہے اور اسے اپنے ساتھ لانے کو کہتا ہے۔ اس میں ہمدردی اور مدد کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ یہ مذہبی تعصبات سے پاک ہے۔ یہی چیز اسے ناول میں اہم کردار کا مقام دیتی ہے۔

۶۔ عادل کے کردار کو ناول میں مختصر اًبیان کیا گیا ہے۔ یہ نادر کا ماموں زاد بھائی ہے۔ یہ غربت میں بھی آسودہ زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس میں انسان دوستی اور محبت کا جذبہ موجود ہے اور یہ قومی ہمدردی رکھنے والا شخص ہے۔

نشان محفل کے متعلق رشید احمد گوریجہ لکھتے ہیں:

> ناول کی فضا رومانی ہے لیکن ناول نگار نے قیام پاکستان کے واقعات کے ساتھ اس کی کہانی منسلک کر کے اسے فسادات کے دور کا ناول بنا دیا ہے جو جزوی طور پر ہی سہی تاریخی نوعیت کی حقیقت ہے۔[۱۳]

دستک نہ دو:

الطاف فاطمہ کا دوسرا ناول "دستک نہ دو" ہے۔ اس ناول کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس ناول کا انگریزی ترجمہ بھی ہوا اور اسے آدم جی ایوارڈ بھی ملا۔ دستک نہ دو میں تقسیم سے پہلے کے ہندوستان اور تقسیم کے بعد پیش آنے والے حالات کے ساتھ کرداروں کے مابین تفریق و امتیاز اور طبقاتی تقسیم سے پیدا ہونے والے مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سلطانہ بخش کہتی ہیں کہ:

> دستک نہ دو ایک دلچسپ معاشرتی ناول ہے جس میں کرداروں کے تضادات کو سامنے لایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ محبت کے نازک جذبات کی بڑی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔[۱۴]

طبقاتی کشمکش بھی انسانی زندگی کا ایک المیہ ہے۔ دنیا میں ہر جگہ اعلیٰ، متوسط اور نچلے طبقے کے لوگ دکھائی دیتے ہیں۔ اس ناول میں ایک جانب تو امراء اور ان کے معیارات زندگی کو دکھایا گیا ہے تو دوسری جانب مفلسی سے پریشان حال لوگوں کو دکھایا گیا ہے۔ امیری اور غریبی کے فرق سے رشتوں اور تعلقات میں جو پیچیدگیاں جنم لیتی ہیں اس ناول میں اس کی واضح تصویر کشی کی گئی ہے۔

اس ناول کی کہانی جہانگیر مرزا کے گھرانے کے گرد گھومتی ہے۔ بیگم شاہ بانو اور جہانگیر مرزا کا تعلق زمیندار گھرانے سے ہے۔ ان کا شمار شہر کے معززین میں ہوتا ہے۔ بیگم شاہ بانو بھی اس ناول کا اہم کردار ہیں۔ یہ دولت کو رشتوں پر مقدم رکھتی ہیں۔ بیگم شاہ بانو کے مطابق دولت کے ذریعے انسان معاشرے میں معزز بنتا ہے اور زندگی کی راحتوں اور آسائشوں کو حاصل کرتا ہے۔ بیگم شاہ بانو اپنے غریب رشتہ داروں کو اہمیت نہیں دیتیں اور نہ ہی ان سے میل جول کو پسند کرتی ہیں۔ انھوں نے اپنی اولاد کی پرورش امرا کے معیارات کے مطابق کی۔ اس لیے ان کی اولاد رکھ رکھاؤ رکھنے والی ہے۔ ان کی اولاد مفلس رشتہ داروں میں محبت کو تلاش کرتی ہے۔ مگر وہ اپنی اولاد کے لیے ان کی حیثیت کے مطابق رشتے تلاش کرتی ہیں۔ بیگم شاہ بانو کے غلط فیصلوں کے سبب ان کی اولاد جذباتی طور پر آسودہ نہیں ہو پاتی۔ بظاہر تو وہ بڑی پر رونق و پر آسائش زندگی بسر کر رہے ہیں مگر اندرونی طور پر کئی محرومیوں کا شکار ہیں اور یہی محرومیاں ان کے اندر خلا کا موجب ہیں۔ جہاں اس ناول کے نسوانی کردار اہمیت کے حامل ہیں وہیں اس ناول کے مرد کردار بھی اہم ہیں۔

ناول کا تعلق صرف انسانی زندگی ہی سے نہیں بلکہ زندگی کو متاثر کرنے والے تاریخی عوامل سے بھی ہے۔ اگرچہ ناول میں سیاسی صورت حال کو واضح طور پر بیان نہیں کیا گیا مگر ہجرت و فسادات کا ذکر ملتا ہے۔ ہجرت انتہائی رنج و غم میں مبتلا کرنے والا واقعہ ہے۔ اپنے ملک، اپنے گھر اور اپنی سرزمین کو خیر آباد کہنا انتہائی کٹھن اور دشوار گزار مرحلہ ہے۔ زندگی میں پیش آنے والے واقعات و مصائب کے سبب انسان کو اپنے وطن کو خیر آباد کہنا پڑتا ہے۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو جب پاکستان وجود میں آیا تو اس وقت بھی سینکڑوں انسانوں کو ہجرت و فسادات سے دوچار ہونا پڑا۔ قیام پاکستان کے موقع پر ہونے والی ہجرت کو پوری دنیا کی سطح پر ہونے والی سب سے بڑی ہجرت قرار دیا جاتا ہے۔ تقسیم ہند کے موقع پر فسادات ہوئے اور اس میں بے شمار لوگوں کو قتل کیا گیا۔ بے شمار ہندوؤں کو ان علاقوں سے ہجرت کرنی پڑی جو کہ پاکستان کا حصہ بن چکے تھے۔ اسی طرح بھارت میں مقیم سینکڑوں مسلمانوں کو بھی راتوں رات اپنا گھر بار چھوڑ کر پاکستان ہجرت کرنا پڑی۔ مرزا صاحب کے گھرانے کو بھی ایسے حالات کا سامنا تھا الطاف فاطمہ ان حالات کا ذکر ناول میں اس طرح کرتی ہیں:

سامان لٹنا تو بیگم صاحب کے سامنے ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ بڑی مشکل سے جیپ والے سپاہی ان کو اور بٹیا کو نکال کر لے گئے تھے۔ اور یہ جیپ یہاں تک لانے میں اس کو کتنے پاپڑ بیلنا پڑے تھے۔ کپور صاحب کے پیروں پڑا تھا وہ اور ان کے سامنے چھاتی کوٹ کوٹ کر رویا تھا، تب جا کر کپور صاحب پورے چھ گھنٹے پیچھے جیپ کا انتظام کر پائے تھے اور اس کے پہنچتے پہنچتے گھر لٹنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ دونوں مالن کی چارپائی پر خاموش بیٹھی تھیں اور مالن زمین پر پلنگ کی پٹی کے پاس گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی۔ بیگم صاحب کے سامنے کھلے منہ تو نہیں بیٹھ سکتی تھی نا! سپاہیوں کے درمیان گھونگٹ نکالے اس کی کوٹھڑی سے نکل کر وہ جیپ تک پہنچی تھیں۔ فوجی سپاہیوں کی حفاظت میں جیپ کے اندر انھیں بیٹھا دیکھ کر اس کو محسوس ہوا تھا کہ بڑا بھاری بوجھ اس کے سر سے اتر گیا ہے۔ اور اتنی خوشی ہوئی تھی کہ وہ یہ تک بھول گیا تھا کہ وہ اب کبھی واپس نہ آنے کے لیے جا رہی ہیں۔۔۔ کوٹھی کے اندر بڑا شور و غل تھا اور راستے خاموش تھے۔ اس شہر میں باقاعدہ فساد شروع ہوئے آج دوسرا دن تھا۔[15]

فسادات اور ہجرت کے دوران انسانی زندگی کی پامالی و بربادی کا تجربہ ہوتا ہے اور انسان کا اپنی حیثیت سے گر جانے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ یہی صورت حال ناول کے کردار بیگم شاہ بانو اور ان کے گھرانے کو پیش آئی تقسیم سے قبل ہندوستان میں وہ ایک پر آسائش زندگی بسر کر رہے تھے ان کے بنگلے میں ملازمین تمام کاموں کو سرانجام دیتے تھے مگر پاکستان ہجرت کے بعد حالات بالکل مختلف تھے:

اماں بیگم کیا کہیں گی! یہ کوٹھی ہے؟ یہ دو چھوٹے چھوٹے بیڈ روم کا مکان اس کو ان کے لیے بہت چھوٹا لگا۔ وہ پھاڑی ہوئی کتابوں، خالی ڈبوں اور بوتلوں کے درمیان کھڑی سوچتی رہی۔[16]

اپنے رتبے اور مقام کو کھو کر ایک ایسی زندگی بسر کرنا بھی انتہائی مشکل مرحلہ ہے۔ مگر یہ ایک تلخ حقیقت ہے جسے ہجرت کے بعد بہت سے گھرانوں کو برداشت کرنا پڑا۔ الطاف فاطمہ نے ناول میں انسانی تاریخ کے دل سوز حالات کو بیان کیا ہے۔ بیگم شاہ بانو انا پرست عورت تھی۔ اس کے نزدیک انسانی رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں وہ محض دولت کی بنا پر اپنے رشتہ داروں کو حقیر سمجھتی اور ان سے غیر انسانی سلوک روا رکھتی تھی۔ وہ طبقاتی اونچ نیچ کو اہمیت دیتی تھی مگر اس کا غرور اس وقت مٹی میں ملتا ہے جب وہ تقسیم کے وقت بے یار و مددگار ہو جاتی ہے۔ وہ ہجرت کرنے پر مجبور ہوتی ہے اس وقت اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے نوکروں کے رحم و کرم پر ہے۔ وہ جان جاتی ہے کہ قدرت کے فیصلوں کے سامنے دولت کی کوئی حیثیت نہیں۔

ناول میں ایک چینی کردار لیو چو (صفدر یاسین) کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ یہ ناول کا ایک اہم مرد کردار ہے۔ یہ کسب معاش کے سلسلے میں ہندوستان پہنچا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب چین نے ابھی آزادی حاصل نہ کی تھی۔ اس ناول میں اس کردار کے ذریعے چین کی نمائندگی کی گئی ہے۔ جو اس وقت ترقی یافتہ ممالک میں شامل نہ تھا۔ اس حوالے سے

اقتباس ملاحظہ ہو: "کیسے چلا جاؤں۔ میرا ملک بہت غریب اور بد نصیب ہے۔ غریب ملک اپنے فرزندوں کو پناہ دینے سے قاصر ہو جاتے ہیں۔ ان کی زمین ان پر تنگ ہو جاتی ہے۔"[۱۷]

الطاف فاطمہ نے ناول "دستک نہ دو" میں رشتوں اور ان سے حاصل ہونے والے رنج و کرب، نفسیاتی مسائل اور انسانی تعلقات کو طبقاتی کش مکش کے پس منظر میں بیان کیا ہے۔

ناول "دستک نہ دو" کے مرد کردار درج ذیل ہیں:

۱۔ جہانگیر مرزا اس ناول کا اہم مرد کردار ہیں۔ جہانگیر مرزا علاقے کے اعلیٰ افسر اور صاحب جائیداد شخص ہیں۔ وہ اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کے سلسلے میں اکثر اوقات گھر سے باہر رہتے ہیں۔ دین سے وابستگی کے سبب وہ انسانی ہمدردی کے جذبات رکھتے ہیں۔ اپنے رشتہ داروں اور ملازمین کے ساتھ نہایت نرمی سے پیش آتے اور ہر ایک کی ضروریات کا خیال رکھتے۔ وہ اپنے عزیز و اقارب کی مدد اس طرح کرتے کہ کسی کو اس کی خبر نہ ہوتی اور لینے والا شخص بھی شرمندہ نہ ہوتا۔ جہانگیر مرزا نیک سیرت اور باوقار شخصیت کے مالک ہیں۔ جہانگیر مرزا جاذب نظر شخصیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے اپنے گھر اور اولاد کی ذمہ داری اپنی بیوی کو بیگم شاہ بانو کے سپرد کی ہوئی تھی۔ جہانگیر مرزا خارجی امور دیکھتے۔

۲۔ صفدر یاسین (لیوچو) ایک چینی مسلمان لڑکا ہے۔ اس کا باپ ایک عالم تھا مگر باپ کے انتقال کے بعد وہ اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔ صفدر یاسین ایک مفلس گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا گھر پیکنگ کی تنگ و تاریک گلیوں میں ہے جس کے کمرے محدود اور صحن مختصر ہے۔ اس لیے وہ اپنی تعلیم چھوڑ کر اپنی ماں اور بہن کا پیٹ پالنے کے لیے تلاش معاش میں نکلا۔ اس کا مالک سانگ اسے پاکستان لے آیا۔ یہاں وہ سانگ کے کارخانے میں جوتے کی مشین پر جوتے بناتا، اس کی دکان پر سیلز مین کا کام کرتا اور شہر میں گھوم کر سائیکل پر چینی دستکاریاں بیچتا۔ صفدر کی ملاقات بیگم شاہ بانو اور ان کی بیٹیوں صولت آرا، ارجمند اور گیتی آرا سے ان کے گھر پر ہی ہوتی ہے۔ وہ ان کے گھر چینی مصنوعات بیچنے جاتا۔ صفدر یاسین محنتی ہونے کے ساتھ ساتھ ہنس مکھ اور حساس طبیعت کا مالک ہے۔ اس کے اندر ہمدردی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ وہ ہر شخص کی مدد کرتا ہے اور اپنے تمام فرائض ایمان داری سے سرانجام دیتا ہے۔ اس کے اندر دوسروں کی خاطر جینے کے جذبات موجود ہیں وہ محض اپنے بارے میں نہیں سوچتا۔ صفدر یاسین میں تخلیقی صلاحیت موجود ہے وہ فارغ اوقات میں پینٹنگ اور مجسمہ سازی بھی کرتا ہے۔ غرض صفدر یاسین کا کردار گیتی آرا کے کردار کی طرح پورے ناول پر محیط ہے۔

۳۔ مسعود ہاشمی آپا کا بیٹا ہے جو جہانگیر مرزا کی رشتہ دار ہیں۔ ہاشمی آپا اور مسعود کا تعارف صولت کی شادی پر ہوتا ہے۔ مسعود ایک یتیم اور غریب لڑکا ہے۔ وہ اپنی غربت پر نادم نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے حالات پر مطمئن ہے۔ گیتی جب

مسعود کے گھر گئی تو اس وقت مسعود کے گھر کے منظر کو ناول میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اس کا گھر چھوٹی چھوٹی اینٹوں سے بنا ہوا ہے جس کی دیواریں اونچی اونچی ہیں۔ جو ایک بوسیدہ حال گھر دکھائی دیتا ہے۔ اس سے ان کی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مسعود ایک سرکاری کالج میں پڑھتا۔ اسے اپنی حیثیت پر شرمندگی نہ ہوتی بلکہ وہ ایک پُر اعتماد شخصیت کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ محنتی بھی ہے۔ وہ محنت کر کے انجینئر بن جاتا ہے۔

۴۔ شہریار جہانگیر مرزا کا بڑا بیٹا ہے۔ شہریار خاندانی وقار و شرافت سے لبریز ایک خوش اخلاق شخص ہے۔ ناول میں اس کا تعارف بھی صولت آرا کی شادی پر ہوتا ہے۔ شہریار آرٹ پسند انسان ہے۔ جب وہ صفدر یاسین کی تخلیقات کو دیکھتا ہے تو ان کی ستائش کرتا ہے۔ شہریار اپنے بہن بھائیوں سے محبت کرتا ہے۔ شہریار ہنس مکھ اور خوش مزاج انسان ہے وہ صولت کی شادی پر رونق لگاتا ہے۔ ناول میں شہریار کے کردار کو مختصر طور پر دکھایا گیا ہے۔ اس کا کردار محض صولت کی شادی پر واضح طور پر نظر آتا ہے مگر اس کا ذکر ناول کے اکثر کرداروں کے ذریعے کیا جاتا رہا ہے۔ جس میں اماں بیگم کے علاوہ اس کے بہن بھائی اور ملازمین شامل ہیں۔

۵۔ بختیار جہانگیر مرزا کا چھوٹا بیٹا ہے۔ اس کا کردار ناول میں جہانگیر مرزا اور شہریار کی موت کے بعد نظر آتا ہے۔ بختیار علی گڑھ میں زیر تعلیم ہے۔ والد کے انتقال کے بعد گھر اور زمینوں کی تمام تر ذمہ داری بختیار کے کندھوں پر آ پڑتی ہے۔ بختیار اپنی جوانی میں باپ اور بھائی دونوں رشتوں سے محروم ہو گیا۔ اس کے باوجود بختیار نے اپنی تمام تر ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے سرانجام دیا۔ بختیار نے اپنے گھر کے تمام افراد کو متحد رہنے کی تلقین کی۔ بختیار معاملہ فہم شخص ہے۔ بختیار نے گیتی کی نفسیات کو بھی بہتر طریقے سے سمجھا۔

۶۔ زبیر ایک خوب صورت و خوب رو نوجوان ہے۔ زبیر پیشے کے اعتبار سے صحافی ہے۔ صولت آرا زبیر کی محبت میں مبتلا ہے۔ زبیر ایک ذہین اور رب کی رضا میں راضی رہنے والا نوجون ہے۔ زبیر اپنے پیشے سے بہت دلچسپی رکھتا ہے اور محنت کرتا ہے۔ اپنی محنت کی بدولت وہ پبلک ریلیشن آفیسر بن جاتا ہے اور اپنے معیار زندگی کو بہتر بناتا ہے۔

۷۔ کرنل سجاد صولت آرا کے شوہر آصف جاہ کا رشتہ دار ہے۔ کرنل سجاد پیشے کے اعتبار سے انٹیلی جینس سے تعلق رکھنے والا ہے۔ کرنل سجاد عقل مند اور عاقبت اندیش ہونے کے ساتھ ساتھ پر کشش اور باوقار شخصیت کا مالک ہے۔ کرنل سجاد حسن پرست انسان ہے اسی لیے صولت کو دیکھتے ہی اس کے حسن کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ کرنل سجاد ہاتھ دیکھنے کا شوق بھی رکھتا ہے۔ اس ناول میں کرنل سجاد کی اہمیت اس لحاظ سے ہے کہ وہ گیتی کی نفسیاتی الجھنوں کو سمجھتا ہے اور اسے ان الجھنوں سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔

چلتا مسافر:

الطاف فاطمہ کا ناول "چلتا مسافر" ۱۹۸۱ء میں فیروز سنز لاہور سے شائع ہوا۔ اس ناول کو بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔ یہ ناول سقوط ڈھاکہ کے متعلق ہے۔ یہ ناول دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں قیام پاکستان کے لیے کی جانے والی کوششوں اور قربانیوں، مالی و جانی نقصانات، فسادات اور مسلم لیگ کے ورکروں کی سرگرمیوں کو اور پاکستان کے حصول کے لیے مسلمانوں کے جوش کو نہایت ہی اثر انگیز الفاظ و انداز میں بیان کیا گیا۔ دوسرے حصے میں ہجرت کے مسائل اور مشرقی پاکستان کے المیے یعنی سقوط ڈھاکہ کے واقعات کو پر سوز انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

قیام پاکستان کے لیے مسلمانوں نے ان تھک محنت کی اور جان و مال کی قربانیاں پیش کیں۔ مسلمانوں کی محنت رنگ لائی اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو مملکت پاکستان وجود میں آئی۔ پاکستان کا قیام اس لیے عمل میں لایا گیا کہ ہندوستان میں دو قومیتیں آباد تھیں ہندو اور مسلم۔ ان دونوں قوموں میں کوئی بھی قدر مشترک نہ تھی۔ لہٰذا مذہب اور تہذیب و ثقافت کی بنیاد پر مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ ریاست قائم کی گئی۔ ہندوستان نے پاکستان کو کبھی دل سے تسلیم نہ کیا اور اس کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ اول تو ہندوستان کی تقسیم میں ہی مسلمانوں (پاکستان) کے ساتھ ناروا سلوک رکھا گیا۔ پاکستان کی جغرافیائی تقسیم اس طرح سے کی گئی کہ اس کے دونوں حصوں یعنی مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں ایک ہزار میل کا ہندوستانی علاقہ موجود تھا۔ اس لیے ان دونوں حصوں کو متحد رکھنا، ان کے لیے ایک متفقہ آئین تیار کرنے کے علاوہ مہاجرین کی آبادکاری اور مخلص قیادت کی ضرورت یہ تمام تر مسائل سر فہرست تھے۔ جن کا سامنا ابتدا سے پاکستان کو کرنا پڑا اس حوالے سے ڈاکٹر صفدر محمود اپنی کتاب "پاکستان کیوں ٹوٹا" میں لکھتے ہیں:

> پاکستان جغرافیائی طور پر ایک وحدت نہیں تھا۔ اس کے دونوں حصے ایک دوسرے سے ایک ہزار میل کے فاصلے پر واقع تھے اور دونوں کے درمیان دشمن کا علاقہ تھا۔[۱۸]

پاکستان کے ساتھ ہر میدان میں غیر مساویانہ سلوک رکھا گیا۔ سیاسی، اقتصادی اور انتظامی طور پر ایسے مسائل پیدا کیے گئے کہ پاکستان اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکے۔ اس لیے ہندوؤں نے پاکستان کی معاشی، سیاسی اور انتظامی صورت حال کا جائزہ لیا اور اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے مشرقی پاکستان کا انتخاب کیا۔ مشرقی پاکستان کی معیشت ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھی۔ اگرچہ قیام پاکستان کے بعد کلکتہ اور مدراس سے مسلمان سرمایہ دار گھرانے مشرقی پاکستان میں ہجرت کر کے آئے۔ مگر وہاں کے مقامی مسلمان غریب اور سادہ لوح تھے اس لیے انھوں نے مسلمان سرمایہ داروں کے بجائے ہندو سرمایہ داروں پر بھروسا کیا کیوں کہ ہندو سرمایہ داروں نے انتہائی مہارت کے ساتھ ان مقامی باشندوں کے اذہان کا رخ اپنی طرف کیا اور انہی مقامی باشندوں کی وجہ سے ہندو بنیے معاشی طور پر مضبوط

ہوئے۔ ہندوؤں نے بہت کم تعداد میں ہندوستان نقل مکانی کی۔ بہت سے ہندوؤں نے اپنے بیوی، بچوں کو ہندوستان منتقل کر دیا مگر خود یہیں سکونت اختیار کی اور پاکستان کی معیشت سے فائدہ اٹھایا۔ ہندو نہ صرف مشرقی پاکستان کی معیشت پر قابض تھے بلکہ تعلیم اور تعلیمی اداروں پر بھی انھی کی اجارہ داری تھی۔ ڈاکٹر صفدر محمود کے مطابق قریبا ۹۵ فیصد سکول ہندو اساتذہ کے اختیار میں تھے۔ ان تعلیمی اداروں میں مغربی پاکستان اور نظریہ پاکستان کے خلاف طلبا کے ذہنوں کو منفی نظریات کی جانب موڑا۔ ان تعلیمی اداروں میں پاکستان مخالف نصاب کی تدریس جاری تھی۔ ڈاکٹر صفدر محمود لکھتے ہیں:

> قیام پاکستان کے بعد ہندو اساتذہ نے بنگالی نوجوان کو مغربی پاکستان کے خلاف بھڑکانے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ اساتذہ طلبا کے لیے جو کتب تجویز کرتے، ان میں سے بیشتر نظریہ پاکستان کے خلاف مواد پر مشتمل ہوتیں۔ متعدد تعلیمی اداروں میں بابائے قوم کے بجائے گاندھی اور جواہر لال نہرو کی تصاویر آویزاں کرنے کو ترجیح دی گئی۔[۱۹]

پاکستان کے دونوں حصوں میں نہ صرف جغرافیائی فاصلہ تھا بلکہ ثقافتی و سماجی اور نسلی و لسانی فرق بھی موجود تھا۔ جسے بھارت سے تعلق رکھنے والے عناصر کسی طور بھی پس پشت نہیں ڈال سکتے تھے۔ آہستہ آہستہ ان دونوں حصوں کو متحد رکھنے والے مخلوط عوامل مذہب اور جدوجہد آزادی بے جان ہونے لگے اور اس کی جگہ احساس محرومی اور صوبائی عصبیت نے لے لی۔ آزادی کے فوراً بعد مرکزی حکومت کی جانب سے کچھ ایسی کوتاہ اندیش پالیسیاں بنائی گئیں جس کی وجہ سے بنگالیوں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ انھیں نظر انداز کیا جارہا ہے۔ رفتہ رفتہ اس احساس محرومی میں مزید اضافہ ہونے لگا۔ دراصل مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی عوام کئی حوالوں سے ایک دوسرے سے مختلف تھی۔ ان دونوں حصوں کے رہن سہن کا طریقہ بھی مختلف تھا۔ مغربی پاکستان کی سیاست جاگیر دار طبقے کے ہاتھوں میں تھی جب کہ مشرقی پاکستان کے سیاست دان زیادہ تر اساتذہ اور وکلاء تھے۔ یہ دونوں حصے سماجی و ثقافتی حوالے سے بھی مختلف تھے۔

اسی طرح ان دونوں حصوں کی زبان بھی مختلف تھی۔ ہر محب وطن شخص کو اپنی زبان اور اپنے وطن کی مٹی سے محبت ہوتی ہے۔ اگر اس کی زبان پر کسی دوسری زبان کو ترجیح دی جائے تو اس پر رد عمل فطری ہوتا ہے۔ یہی رد عمل مشرقی پاکستان کی جانب سے بھی ہوا جب پاکستان کی قومی زبان اردو کو قرار دیا گیا تو اس اعلان نے مشرقی پاکستان میں ہلچل پیدا کر دی اور یہ ان دونوں حصوں کے مابین فرق کی پہلی اینٹ تھی لہٰذا سقوط ڈھاکہ کا ایک سبب اردو بنگالی کا لسانی تنازع بھی تھا۔ اردو اور بنگالی زبان کا تنازع بر وقت حل نہ ہونے کے سبب اس مسئلے نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی اور مشرقی پاکستان کے باشندوں میں یہ تاثر پیدا ہونے لگا کہ پاکستان کا حکمران طبقہ بنگالی زبان کو پس پشت ڈال کر اس کو مٹانے کی سازش کر رہا ہے۔ بعد ازاں دیگر سیاسی مسائل کے سبب مشرقی پاکستان میں حالات کشیدہ

ہونے لگے اور احتجاجوں کے سلسلے کا آغاز ہوا۔ مکتی باہنی کی تنظیم نے مشرقی پاکستان میں قتل وغارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ اس تنظیم کو بھارت کی جانب سے مالی و عسکری معاونت حاصل تھی۔ اس حوالے سے شاہد رشید لکھتے ہیں:

> مکتی باہنی گوریلا تنظیم کی تشکیل بھارتی فوج نے ہی کی تھی اس گوریلا تنظیم نے قتل عام شروع کر رکھا تھا۔ بھارتی فوجی اہلکار سادہ لباس میں تخریبی کاروائیوں میں شامل تھے۔ عمارتیں اور ذرائع مواصلات خاص طور پر ان کا نشانہ بن رہے تھے اور غیر بنگالی تو بالکل غیر محفوظ تھے۔ ہندوستانی فوج اور مکتی باہنی خودکار ہتھیار سنبھالے بازاروں میں آزادانہ پھرتے اور جو چاہتے کرتے۔ حالات تیزی سے بگاڑے جارہے تھے۔ پاکستانی فوج کئی محاذوں پر لڑ رہی تھی جبکہ سرحدوں پر شدید دباؤ تھا۔ عوامی لیگ کے مطالبات اور دیگر وجوہات میں دن بدن شدت آتی جارہی تھی کہ ۱۶ دسمبر کی وہ سیاہ صبح دلوں پر لرزہ طاری کرتے سقوط ڈھاکہ کی خبروں کے ساتھ آہی گئی۔[۲۰]

سقوط ڈھاکہ کے موقع پر سب سے زیادہ ظلم وستم کا نشانہ غیر بنگالی (بہاری) بنے۔ انھوں نے دو تقسیموں کے کرب کو سہا۔ صدیق سالک کے مطابق فسادات میں ۳ مارچ کو ۱۰۲ بہاریوں کو قتل کیا گیا۔ الطاف فاطمہ نے ناول "چلتا مسافر" میں بہاریوں کو پیش آنے والے حالات کو بیان کیا ہے۔ ایک جانب تو بہاریوں نے حصول پاکستان کے لیے جدوجہد کی اور قربانیاں پیش کیں اور ہجرت کا دکھ بھی برداشت کیا تو دوسری جانب آزادی کے بعد مشرقی پاکستان میں انھیں قبول نہ کیا گیا۔

"چلتا مسافر" حوالے سے ڈاکٹر نجمہ صدیق کا کہنا ہے:

> مشرقی پاکستان کا المیہ ایک بے حد جذباتی موضوع ہے مگر الطاف فاطمہ کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اسے نہایت غیر جذباتی ہو کر لکھا ہے اور کسی قسم کے طنز اور تلخی کے بغیر خوف، تعصب اور نفرت کی اس فضا کی معروضی تصویر کشی کی ہے جس نے ان سب کو ایک پیار بھرا کنبہ بنانے کی بجائے 'بھان متی' کے کنبہ میں تبدیل کر دیا۔ اور بنگلہ دیش بننے میں بہاریوں نے جو ظلم سہے اس کی تصویر الطاف فاطمہ نے مزمل اور اس کے کنبہ کے حوالے سے بیان کر دی ہے۔[۲۱]

یہ کہانی بہار کے علاقے پٹنہ سے تعلق رکھنے والی سید فیملی کی ہے۔ سید صاحب اور ان کا بیٹا مزمل مسلم لیگ کے کارکن ہیں اور وہ پر امن طریقے سے قیام پاکستان کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ قیام پاکستان کے حوالے سے سید صاحب کہتے ہیں:

> پانچ سال پہلے میری قوم نے جو خواب دیکھا تھا، وہ حقیقت میں ڈھل رہا ہے اور ڈھل کر رہے گا۔ تم کہتی ہو میں ایسی باتیں نہ کیا کروں، لیکن بیگم، اگر تم بھی لاہور کے اس اجتماع میں موجود ہوتیں تو تم اس خواب کو فراموش نہ کرتیں۔ جناح صاحب کے چہرے کا وہ سکون، وہ عزم اور ہر

ہر صوبے کے مسلمانوں کا وہ جوش اور سب سے زیادہ ولولہ انگیز وہ لمحہ جب شیر بنگال نے سٹیج پر
آکر قرار داد پاکستان پیش کی اور۔۔۔اور۔۔۔"ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔[۲۲]

غرض سید صاحب کو قیام پاکستان سے جذباتی وابستگی تھی۔ان کے گھرانے نے قیام پاکستان کے لیے قربانیاں دیں۔یہ خاندان فرقہ واریت کو پسند نہیں کرتا تھا اور نہ ہی لسانی و علاقائی اختلافات رکھتا تھا۔بلکہ سب مل کر بھائی چارے کے ساتھ رہتے تھے۔ڈاکٹر ممتاز احمد خان کا ناول "چلتا مسافر" کے بارے میں کہنا ہے:

چلتا مسافر ۱۹۸۰ کی دہائی میں سامنے آیا۔یہ سابق مشرقی پاکستان کے پس منظر میں ایک بہت بڑے المیہ کو ابھارتا ہے۔اس میں بھی بتایا گیا ہے کہ کس طرح صوبہ بہار (ہندوستان) کی سید صاحب کی ایک فیملی جو کہ غیر متعصب اور بے ریا ہے اپنی آدرش پسندی میں مادی و روحانی تکالیف کا شکار ہوتی ہے۔سید صاحب کی نگاہ میں علاقائیت اور لسانی و گروہی تعصبات قابل مذمت ہیں۔وہ اپنی ایک بیٹی کی شادی پاکستان بننے سے قبل ایک پنجابی گھرانے میں اس لیے بھی کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک پنجاب پاکستان میں شامل ہونے والا تھا۔اپنی آدرش پسندی کے تحت وہ بنگالی بہاری تفریق یا کسی بھی قسم کی مسلمانوں کے درمیان تفریق کو تسلیم نہیں کرتے ان کے دوستوں میں غیر مسلم بھی ہیں۔ان کی اولاد بھی مسلمانوں کے ایک علیحدہ وطن کے لیے جان دینے کے لیے تیار ہے۔غرض ان کے یہاں سب لوگ آدرشی ہیں۔[۲۳]

چلتا مسافر سقوط ڈھاکہ کے پس منظر میں لکھا گیا ناول ہے۔جس میں سیاسی، اخلاقی اور تعلیمی انتشار کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ تقسیم سے قبل کے حالات، ہجرت اور اس کے بعد کے حالات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

اس ناول کے مرد کردار درج ذیل ہیں:

۱۔سید صاحب ہندوستان کے صوبہ بہار کے شہر پٹنہ سے تعلق رکھتے ہیں۔سید صاحب حساس دل رکھنے والے باوقار شخصیت کے مالک ہیں۔دنیاوی تعلیمات کے ساتھ ساتھ دینی تعلیمات سے وابستہ ہیں اور ان پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔سید صاحب مسلم لیگ کے ورکر ہونے کی حیثیت سے پُر امن طریقے سے قیام پاکستان کے لیے سرگرم عمل ہیں۔اقبال کی شاعری سے سید صاحب کو خاصہ شغف ہے۔قائداعظم اور پاکستان سے جذباتی وابستگی ہے۔اس حوالے سے سید صاحب کہتے ہیں:"یہ خواب میں نے اکیلے تو نہیں دیکھا۔یہ تو میری قوم کا وہ فیصلہ ہے جسے خیبر سے راس کماری تک کے مسلمانوں کی حمایت حاصل ہے۔"[۲۴]

۲۔مزمل سید صاحب کا منجھلا بیٹا ہے۔مزمل نے علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی اور مسلم لیگ کا ایک سرگرم رکن رہا۔تحریک آزادی میں اس نے اور اس کے خاندان نے اپنی خدمات انجام دیں۔فسادات میں مزمل کا بڑا بھائی مدثر شہید ہوا ادھر پنجاب میں مزمل کی بہن زہرہ اور اس کے سسرال والے بھی فسادات کا شکار ہوئے جس میں اس کی بہن بھی

قتل کر دی گئی۔ سید صاحب کا صدمے سے انتقال ہو گیا۔ قیام پاکستان کے بعد مزمل اپنے گھر والوں کے ساتھ مشرقی پاکستان کے شہر ڈھاکہ میں آباد ہوا۔ وہاں بھی مزمل اور اس کے خاندان کو اجنبیت کا احساس ہوا۔ مزمل کو شاعری اور صوفیانہ کلام سے دلچسپی تھی وہ اپنے فارغ اوقات میں سلطان باہو کی شاعری اور کشف المحجوب پڑھا کرتا۔ مزمل نے مرلی اور بذلل رحمٰن کو ان کے بچپن میں انگریزی اور دوسرے مضامین پڑھائے۔ مزمل اردو، پنجابی، عربی، بنگالی اور انگریزی زبانوں پر دسترس رکھتا تھا۔ مزمل ایک حساس دل، مخلص اور خوددار شخص ہے۔ وہ مشکل حالات میں بھی اپنی خودداری کو برقرار رکھتا ہے۔ اور اپنے وقار پر ٹھیس نہیں آنے دیتا۔ مشرقی پاکستان میں جب مکتی باہنی کی تحریک چلی تو پھر سے مزمل اور اس کے گھر والوں کو مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ جس سرزمین کے لیے وہ اپنا مال و دولت، اپنے رشتے قربان کر کے آئے تھے اس سرزمین نے انھیں قبول نہیں کیا اور وہ ایک بار پھر فسادات کا شکار ہوئے۔ بعد ازاں مزمل نے پھر سے سیاسی معاملات میں دلچسپی لینا شروع کی اور راہ انسانیت میں اپنی خدمات انجام دینے لگا۔ مزمل لسانی اور علاقائی تفرقہ پسندی کے خلاف ہے لیکن اسے کسی شر پسند نے چھرا گھونپ کر قتل کر دیا۔

۳۔ بذلل رحمٰن ایک بنگالی مسلمان لڑکا ہے۔ اس کی ماں اس کے بچپن میں ہی مر جاتی ہے اور اس کی سوتیلی ماں اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں رکھتی۔ اس کے والد رحمٰن صاحب ڈاکٹر ہیں وہ بھی بذلل کو مکمل توجہ نہیں دیتے۔ بذلل محبت کی تلاش میں مزمل کے گھر جاتا ہے۔ اسے وہاں راحت و اپنائیت محسوس ہوتی ہے اور وہ اپنے دکھ درد بھول جاتا ہے۔ راشدہ بیگم بھی بذلل کا اپنے بیٹے کی طرح خیال رکھتی ہیں۔ جب وہ بیمار ہوتا ہے تو مزمل اور اس کی بیوی بذلل کا ایسے خیال رکھتے ہیں جیسے اپنی اولاد کا خیال رکھتے ہیں۔ بذلل کو ان سے جذباتی لگاؤ ہوتا ہے۔ بذلل ڈھاکہ یونی ورسٹی میں پڑھتا ہے۔ وہ عقل و دانش والا شخص ہے۔ ادب سے دلچسپی رکھتا ہے۔ آرٹ اور فن پسند شخصیت کا مالک ہے۔ بذلل سادگی پسند شخص ہے۔ بذلل کا دل حساس اور ہمدردانہ جذبات کا حامل ہے۔ اس کے اندر بھائی چارے کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ وہ فساد اور انتشار کو پسند نہیں کرتا۔ اسے سیاست میں دلچسپی ہے اور وہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان ہونے والے فسادات میں لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ ان کو راشن مہیا کرتا ہے۔ اس کے ماتحت کام کرنے والے بھی لوگوں کی مدد کا جذبہ رکھتے ہیں۔ وہ ان حالات میں مزمل صاحب کے بہاری خاندان کی ہر ممکن مدد کرتا ہے اور اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر مدثر کو پاکستان پہنچانے کے انتظامات کرتا ہے۔

۴۔ مدثر 'مزمل کا بیٹا ہے۔ مزمل نے مدثر کا نام اپنے مرحوم بھائی کے نام پر رکھا۔ مدثر ڈھاکہ میں پیدا ہوا اور اسی سر زمین پر پروان چڑھا۔ مدثر بنگلہ زبان بہت اچھے سے بولتا۔ وہ ایک ہنس مکھ اور شریر لڑکا ہے۔ وہ بھی بذلل کے ساتھ ڈھاکہ یونی ورسٹی میں پڑھتا ہے۔ بذلل اور سلسبیل سے اس کی دوستی ہے اور مدثر ان دونوں کو ملوانے کی کوشش کرتا ہے۔ مدثر اپنے بھائی کے لندن جانے کے بعد خود کو تنہا محسوس کرنے لگا اور فسادات سے اس کا دل پریشان ہونے

لگا۔ کیوں کہ اس کے اندر زندہ رہنے کی امنگ ہے۔ وہ زندہ لاش کی طرح جینے کے خلاف ہے۔ اس لیے پہلے تو وہ اپنے ماں باپ کو ان حالات میں پریشان نہیں کرنا چاہتا اور صبر سے کام لیتا ہے۔ مگر وہ پاکستان جانے کے لیے اپنے ماں باپ کو راضی کرتا ہے۔ اور مشکل حالات اور کٹھن راستوں کا سامنا کرتے ہوئے پاکستان پہنچ جاتا ہے۔ مدثر اس دیار غیر میں جہاں اس کے ماں باپ، بہن، بھائی نہیں ہیں اکیلے ہمت سے کام لیتے ہوئے زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ اپنی خودداری قائم رکھتے ہوئے اور اپنے باپ کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے کسی سے مدد لینا نہیں چاہتا۔ وہ اپنے روشن مستقبل کے خواب دیکھتا ہے اور اس کے لیے محنت کرتا ہے۔

۵۔ سمیع اللہ بذلل کے ماتحت کام کرتا ہے۔ یہ ایک بنگالی مسلمان شخص ہے۔ اس نے بذلل کے حکم پر مدثر کو پاکستان پہنچانے کی ذمہ داری لی اور اپنی جان جوکھم میں ڈال کر مدثر کو اس کی منزل تک پہنچایا۔ سمیع اللہ ناول میں ایک ضمنی کردار ہے اور ناول میں اس کا ذکر مختصر ہے۔ سمیع اللہ کا تعارف ناول میں اس وقت ہوتا ہے جب بذلل مدثر کو پاکستان پہنچانے کا ذمہ لیتا ہے۔ سمیع اللہ ایک ذمہ دار شخص ہے۔ اس نے اپنی ذمہ داری کو خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔

۶۔ سلمان سلسبیل کا تایازاد اور اس کا منگیتر ہے۔ یہ بھی ناول میں ضمنی کردار ہے اور اس کا ذکر بھی ناول میں مختصر طور پر کیا گیا ہے۔ سلمان اور سلسبیل کے خاندان کا تعلق سیالکوٹ سے ہے مگر یہ لوگ لاہور میں رہائش پذیر ہیں۔ سلمان ایک امیر خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ سلمان دوسروں بالخصوص سلسبیل کے جذبات کا خیال رکھنے والا شخص ہے۔ وہ اس کی دل جوئی کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے اور اس کا بے حد خیال رکھتا ہے۔

خواب گر:

الطاف فاطمہ کا آخری ناول "خواب گر" ۲۰۰۵ء میں فیروز سنز لاہور سے پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ یہ ناول ۲۹ ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ ناول گلگت بلتستان کے معصوم مزاج اور سادہ لوح کرداروں سے متعلق ہے۔

بلتستان ایک قدیم خطہ ارض ہے جو قبل مسیح میں پلولو بعد ازاں تبت خورد کے ناموں سے مشہور ہوا۔ ۱۸۴۸ء میں بلتستان پر کشمیر کے ڈوگرہ حکمران قابض ہوئے۔ اس سے قبل گلگت بلتستان آزاد ریاستیں تھیں۔ انگریز حکمرانوں نے جب کشمیر ڈوگروں کو فروخت کیا اس وقت گلگت بلتستان کشمیر کا حصہ نہ تھے۔ مگر جب رنبیر سنگھ بادشاہ بنا تو اس کی افواج نے گلگت بلتستان کو فتح کیا اور اسے کشمیر کا حصہ بنایا۔ بلتستان کی عوام نے تقسیم برصغیر کے ایام میں اپنی جنگ آزادی خود لڑی۔ قیام پاکستان کے بعد گلگت میں کرنل مرزا خان اور راجا خان کی قیادت میں انقلاب رونما ہوا تو بلتستان کی عوام نے بھی ڈوگرہ حکومت کی مخالفت میں آواز بلند کی۔ لہٰذا ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کو بلتیوں نے مکمل طور پر آزادی حاصل کرلی۔

اس حوالے سے الطاف فاطمہ اس ناول "خواب گر" میں رقم طراز ہیں:

> اگست ۱۹۴۷ء کو بلتستان کا علاقہ ڈوگرا راج کے استبداد سے آزادی اور نجات حاصل کرنے کے لیے تحریک آزادی کشمیر میں شامل ہوا اور ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کو ڈوگرا راج کے تسلط سے آزاد ہو کر پاکستان کے علاقے میں شامل ہو گیا۔[۲۵]

اس ناول "خواب گر" کی کہانی بلتستان کے ان پہاڑی علاقوں کے گرد گھومتی ہے جہاں کے باشندوں کو زندگی گزارنے کے لیے دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ تقسیم سے قبل کا بلتستان ہے جب اس علاقے کے لوگوں کو سہولیات زندگی میسر نہ تھیں۔ اکثر اس علاقے کے لوگوں کو نمک کی کمی کے باعث ہونے والی بیماری کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس وقت ان علاقوں میں نہ ہی سکول، کالج تھے اور نہ ہی سفر کی سہولیات میسر تھیں۔ تلاش معاش کے سلسلے میں اس علاقے کے باشندوں کو میدانی علاقوں کا رخ کرنا پڑتا۔ ان علاقوں تک پہنچنے کے لیے کئی ماہ لگ جاتے۔ مشقت طلب راستوں سے گزر کر میدانی علاقوں میں پہنچنے کے بعد انھیں معمولی اور محنت و قوت طلب نوکریاں ملتیں مثلاً ہوٹلوں، تندوروں، لاری اڈوں اور پہاڑی علاقوں میں بنتی سڑکوں کی تعمیر وغیرہ میں۔ مگر وہ صبر و شکر کے ساتھ دل و جان سے محنت کرتے۔ ہوٹل میں بیراگیری کی ملازمت ان کے ہاں باعث فخر سمجھی جاتی تھی۔ ان قافلوں کا ذکر الطاف فاطمہ اس طرح سے کرتی ہیں:

> کھلے موسموں کی بہاروں میں یہ قافلے سکردو سے گزرتے فلک بوس کوہساروں کی چوٹیوں کے سائے میں دروں سے نکلتے ہوئے لداخ اور سکم کے علاقے تک پہنچنے کے لیے، ایسی ڈھلانوں پر اترتے، ایک ایسی لمبی قطار کی صورت میں کہ دیکھنے والا یہ دیکھ کر سوچ بھی نہیں سکتا کہ ننھی ننھی چیونٹیوں جیسی یہ قطاریں میدانی علاقوں میں فرد فرد ہو کر بکھریں گی تو ایسی قوت اور مشقت کے مظاہرے ان سے سرزد ہوں گے کہ اس کا اندازہ نہ تو خود ان کو ہو گا اور دیکھنے والا تو اس کو خیالی عمل ہی کہے گا۔ اور یہ بڑے سکوت و قرار کے ساتھ زندگی کے سال ہا سال خوش حالی کے درمیان رہ کر دوسروں کو دولت کمانے میں مدد دیں گے۔[۲۶]

تبت خورد کے یہ باشندے نہ صرف اپنے گھرانے بلکہ اپنے علاقے کے روشن مستقبل کے خواب دیکھتے ہیں۔ اپنی گزر اوقات چاہے مشکل ہو مگر اپنے گھر والوں کے لیے پیسہ جوڑتے ہیں۔ اپنے قریبی رشتوں سے سالہا سال دور رہنا ان کے اندر خلا پیدا کرتا ہے۔ اس دوری اور محرومی سے رشتوں میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ اس پہلو کو ابراہیم اور دیگر کرداروں کے ذریعے الطاف فاطمہ نے ناول میں بڑی مہارت سے بیان کیا ہے۔

بلتستان کے باشندوں کو بلتی یا دردی کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ بہت محنتی، سادہ لوح اور ایمان دار ہوتے ہیں۔ الطاف فاطمہ مختلف موقعوں اور واقعات میں بارہا ان کی خصوصیات بیان کرتی نظر آتی ہیں:

اجتماعی طور پر یہ بلتی بہت حلیم، شفیق اور بامروت لوگ ہوتے ہیں۔ خلوص اور محبت ان کا کردار اور امتیازی وصف ہوتا ہے، جس میں ظاہر داری یا تصنع کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔[۲۷]

بلتیوں کے روزگار کے متعلق مصنفہ ناول میں لکھتی ہیں:

ایک زمانہ تھا کہ شملہ، ڈلہوزی اور کشمیر میں یہ کام کی تلاش میں آتے اور ہوٹلوں، بیکریوں سے لے کر لکڑی کی ٹالوں اور پہاڑی علاقوں میں بار برداری، غرض ہر قسم کی محنت و مشقت کرنے میں مصروف یا جتے ہوئے نظر آتے تھے۔[۲۸]

یہ ناول تین نسلوں پر محیط ہے۔ جس خوش آئند مستقبل کے خواب نانا نے دیکھے تھے ان خوابوں کو اس کے نواسے نے پورا کیا۔ الطاف فاطمہ نے اس ناول میں ایسے زمانے کو پیش کیا ہے جب ہندوستان انگریزوں کا محکوم تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزوں کی سیکریٹ سروس کے افسران تبت، گلگت، ہنزہ اور دیگر دور دراز کے علاقوں میں تنہا پھرتے اور اس علاقے کا جغرافیہ معلوم کرنے کے ساتھ ساتھ وہ وہاں کے مقامی لوگوں کے بارے میں معلومات اکھٹی کرتے۔ وہ وہاں کی مقامی زبانوں پشتو، بلتی کے علاوہ اردو زبان بھی سیکھتے۔ الطاف فاطمہ نے اس حوالے سے انگریز کردار فریڈرک ہسٹن کو ناول میں متعارف کروایا۔ "خواب گر" میں آزادی سے پہلے، آزادی اور آزادی کے بعد ۶۵ کی جنگ کو بھی بیان کیا ہے۔

خواب گر کے مرد کردار درج ذیل ہیں:

۱۔ ابراہیم ناول کا اہم مرد کردار ہے۔ یہ خواب گر ہے خواب دیکھتا ہے اور ان خوابوں کی تعبیر کے لیے پر امید ہے۔ ابراہیم رستم علی کا بیٹا ہے۔ ان کا گھرانہ علاقے کے معززین میں شمار ہوتا ہے۔ یہ گھرانہ دو تہذیبوں کی نمائندگی کرتا ہے ایک تہذیب جو دریائے قندھار کے علاقے سے تعلق رکھتی ہے دوسری لداخ و سکم کی تہذیب ہے۔ ابراہیم نہایت خاموش طبع، سنجیدہ اور سادہ طبیعت کا مالک ہے۔ اس میں محنت، جفاکشی اور صبر و استقلال جیسی صفات موجود ہیں۔ والد کی وفات کے بعد اپنے بھائی اسمٰعیل کا بازو بننے کی غرض سے تیرہ برس کی عمر میں اس نے میدانی علاقوں کا رخ کیا۔ میدانی علاقوں میں محنت مشقت کر کے روزی کمائی اور اپنی ایمانداری کے سبب بیراگیری کی ملازمت حاصل کی۔ ابراہیم ایک ہنر مند انسان ہے اس نے لکڑی کے کام کا ہنر سیکھا اور اپنی شادی کے موقع پر ایک نئی طرز کا اطاق تیار کیا جو کہ اس علاقے میں سب سے مختلف تھا۔ اس کی شادی ماہ خاتون سے ہوئی۔ ابراہیم خواب گر ہے اس نے اپنے اور اپنے علاقے کے لیے خواب دیکھے۔ وہ خواب دیکھتا ہے کہ وہ پڑھے گا اور پھر اپنے علم سے سب کو فیض یاب کرے گا۔ اس کا یہ خواب اس کے نواسے نے پورا کیا۔ وہ اپنے علاقے کے بہتر مستقبل اور ترقی کے خواب دیکھتا ہے کہ اس کا شہر روشنیوں کا شہر بنے گا اور اس میں خوب رونق و چہل پہل ہو گی لوگ ہوا کے ذریعے سفر کریں گے اور اس کا یہ خواب بھی پورا ہوتا ہے۔

۲۔ اسمٰعیل 'ابراہیم کا بڑا بھائی ہے۔ یہ ایک قناعت پسند شخص ہے۔ والد کی وفات کے بعد گھر کی تمام تر ذمہ داریاں اس پر آجاتی ہیں اور وہ انھیں بڑی خوش اسلوبی سے سر انجام دیتا ہے۔ وہ اپنی روایتوں کا پاس دار ہے۔ اسمٰعیل اپنے بھائی ابراہیم سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس لیے وہ اور اس کی بیوی سکینہ اس کا اپنی اولاد سے بڑھ کر خیال رکھتے ہیں۔ اسمٰعیل کو اپنی زمین سے عشق ہے وہ اپنا گھر اور زمین کو چھوڑ کر میدانی علاقوں میں ملازمت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس لیے وہ اپنی موروثی زمین پر ہی کاشت کرتا اور اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے کوٹ، صدریاں اور اونی کمبل گلگت اور اس سے آگے کشمیر کے پہلے پڑاؤ تک جا کر بیچ آتا ہے۔

۳۔ کاکا سبحان ناول کا ضمنی کردار ہے اس کا ذکر ناول کے ابتدائی صفحات میں انتہائی مختصر ہے جب ابراہیم میدانی علاقے سے ملازمت کر کے پہلی مرتبہ اپنے علاقے میں آتا ہے۔ کاکا سبحان ایک عالم اور ایک جہاں دیدہ شخص ہے۔ وہ میدانی علاقوں میں رہ کر آتے ہیں۔ انھیں اپنے امتیازی اوصاف سے محبت ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ یہ ہمیشہ باقی رہیں مگر چوں کہ وہ دور اندیش ہیں اس لیے وہ جانتے ہیں کہ آہستہ آہستہ یہ فاصلے ختم ہو رہے ہیں تو کہیں ان کی قوم میں بھی ہوس و لالچ پیدا نہ ہو جائے۔

۴۔ فریڈرک ہسٹن اس ناول کا اہم مرد کردار ہے۔ یہ ہندوستانی نژاد برطانوی شخص سیکریٹ سروس کا آفیسر ہے۔ اس کے والد کرنل البرٹ ہسٹن بھی سیکریٹ سروس سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی پوسٹنگ کی وجہ سے فریڈرک قبائلی علاقوں میں پلا بڑھا تھا۔ اس کی پرورش مسلمانوں زربادشاہ اور گل خانم جان کے ہاتھوں ہوئی۔ اس لیے اس کے مزاج میں بھی اپنے برطانوی لوگوں سے فرق تھا۔ وہ حرام گوشت نہ کھاتا۔ وہ سیکریٹ سروس میں ہونے کی وجہ سے بہت سی زبانوں پر دسترس رکھتا ہے۔

۵۔ علی مردان 'ابراہیم کا بھتیجا ہے۔ اس نے ماہ رو کا اس کی ماں کے چھوڑ جانے کے بعد بہت خیال رکھا۔ علی مردان کی شادی ماہ رو سے ہوئی۔ علی مردان کھیتوں میں کام کرتا تھا مگر گھر کے حالات بہتر نہ تھے غربت کے باعث گزر اوقات مشکل ہو گئی۔ اس لیے اس نے بھی کسب معاش کے لیے میدانی علاقوں کا رخ کیا۔ وہ خط اور اخبار پڑھ لیا کرتا۔ اس نے لاہور شہر میں ملازمت کی اور نیڈوز ہوٹل میں رہائش رکھی۔ وہ ہوٹل میں بیکنگ اور ویٹری کا کام کرتا۔ علی مردان محب وطن شخص ہونے کے سبب ان لوگوں کی باتوں سے کڑھتا تھا جو وطن کی آزادی کے خلاف باتیں کرتے تھے۔

۶۔ اسمٰعیل خلیل اللہ علی مردان کا بیٹا ہے۔ ماہ رو کی بے وفائی کے بعد علی مردان جب واپس ملازمت پر آتا ہے تو علی مردان کو بھی ساتھ لے آتا ہے۔ وہ اسے درزی کے پاس کام سیکھنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے مگر خلیل یہ کام چھوڑ کر کینٹین میں کام کرتا ہے۔ یہ بڑا ذہین اور عقل مند بچہ ہے۔ شہلا باجی اسے سکول میں داخل کرواتی ہیں اور وہ محنت کر کے ڈاکٹر بنتا ہے اور اپنے نانا کا خواب پورا کرتا ہے۔

الطاف فاطمہ نے اپنے تمام ناولوں میں ہجرت و فسادات کو کُلی یا جزوی طور پر موضوع بنایا ہے۔ ان کے ناول "نشان محفل" میں جہاں رومانی معاملات اور مشرق و مغرب کے تہذیبی تصادم کو بیان کیا ہے وہیں ہجرت و فسادات کا بھی ذکر ہے۔ روبینا اور ایبک کے کردار کے ذریعے مہاجروں کی مشکلات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ناول "دستک نہ دو" میں محبت کے جذبات، رشتوں میں تصادم، نفسیاتی الجھنوں اور طبقاتی کشمکش کو پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول میں جہانگیر مرزا کے گھرانے نے بھی ہجرت کی مشکلات کا سامنا کیا ہے۔ ہجرت کی وجہ سے انھوں نے اپنا مقام و رتبہ کھویا ہے۔ "چلتا مسافر" کا موضوع ہی ہجرت ہے۔ اس ناول کا آغاز قیام پاکستان کے لیے تحریک پاکستان میں کی جانے والی کوششوں اور پاکستان کے لیے مسلمانوں کے جوش و محبت سے ہوتا ہے۔ ناول میں قیام پاکستان سے پہلے ہی ہندوستان میں ہندو مسلم کے مابین ہونے والے فسادات کا ذکر ملتا ہے۔ ناول کے دوسرے حصے میں بہار سے ہجرت کر کے آنے والے مہاجروں (بہاریوں) کو پیش آنے والی مشکلات اور پھر مشرقی پاکستان میں ان پر ٹوٹنے والی قیامت کا پتا چلتا ہے۔ ناول "خواب گر" میں بلتیوں کی دشوار گزار زندگی، ان کی صفات اور ان کے خوابوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں قیام پاکستان اور ۱۹۶۵ء کی جنگ کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے البتہ اس ناول میں باقاعدہ یا کلی طور پر ہجرت کے موضوع کو بیان نہیں کیا گیا مگر اس ناول میں جو عہد بیان کیا گیا ہے وہ تقسیم ہند سے قبل، اس کے بعد کا ہے جس میں تقسیم کے بعد پیش آنے والی مشکلات اور ان کے اثرات کو مرکزی کردار کے مشاہدے کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ الطاف فاطمہ اس حوالے سے غیر جانب دار نظر آتی ہیں۔ انھوں نے جذباتیت و ہیجانیت سے کام نہیں لیا بلکہ ہجرت و فسادات کے ذریعے اٹھائے جانے والے دکھوں اور غموں کا اظہار نہایت مؤثر کن انداز میں کیا۔ "دستک نہ دو" میں جہاں چاچا جی کا اپنے ہندو دوست کو بچاتے ہوئے اپنے ہم مذہبوں کے ہاتھوں کے قتل ہو جانے کا ذکر کیا ہے وہیں جہانگیر مرزا کے ملازم شریف کے شہید ہونے پر مرلی جو ایک ہندو ملازم ہے اس کے ذریعے گیتی کے گھرانے کی مدد کرنے کو بھی دکھایا گیا ہے۔ ڈاکٹر عظمت رباب اور ڈاکٹر صائمہ ارم اس حوالے سے لکھتی ہیں:

> اردو افسانوی ادب میں الطاف فاطمہ کا نام نمایاں مقام کا حامل ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں جو موضوعات پیش کیے ہیں۔ ان میں غالب موضوع ہجرت، آزادی کا تصور اور ہجرت کے مسائل و مشکلات کا بیان ہے۔[۲۹]

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو الطاف فاطمہ اپنے ناولوں میں جہاں رومانوی اور نفسیاتی کشمکش کو بیان کرتی ہیں وہیں ان کے ناولوں میں اس عہد، مقام و معاشرت کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ انھوں نے قیام پاکستان کے موقع پر ہونے والے فسادات، ہجرت اور مہاجرین کی زبوں حالی کو مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔ زبان و بیان، کردار نگاری، مکالمات اور منظر نگاری کے ذریعے اپنے ناولوں کو دلچسپ بنایا۔ ان کی کہانیوں کے واقعات نہ صرف دلچسپ

بلکہ مربوط ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں میں طوالت کے باوجود دلچسپی قائم رہتی ہے۔ الطاف فاطمہ کے ناولوں کے کردار اپنی تہذیب کی نمائندگی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں برعظیم کی تہذیب و معاشرت کو پیش کیا گیا ہے۔ ان کے کردار اس معاشرے کی روایات و اقدار کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ یہ کردار یوپی، بہار اور بلتستان سے تعلق رکھنے والے ہیں اور اپنی روایتوں کے پاس دار ہیں۔ الطاف فاطمہ کے یہ ناول اس لیے بھی اہم ہیں کہ اس میں اس عہد کی سیاست کے معاشرت پر ہونے والے اثرات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

حوالہ جات

۱. ڈاکٹر ریاض ہمدانی، اردو ناول کا نو آبادیاتی مطالعہ (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۸ء)، ص ۱۴۵۔

۲. رفیع الدین ہاشمی، اصناف ادب (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص ۱۱۶۔۱۱۷۔

۳. عظیم الشان صدیقی، اردو ناول - آغاز و ارتقاء (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۸)، ص ۳۲۔

۴. ڈاکٹر اسلم آزاد، اردو ناول آزادی کے بعد (یوپی: نکھار پبلی کیشنز، ۱۹۸۱ء)، ص ۱۷۔

۵. سہیل بخاری، اردو ناول نگاری (دہلی: الحمرا پبلشرز، ۱۹۷۲)۔ ص ۲۵۔

۶. ڈاکٹر یٰسین، ناول کا فن اور نظریہ (لاہور: میٹرو پرنٹرز، ۲۰۱۳)، ص ۱۷۔

۷. ڈاکٹر اسلم آزاد، اردو ناول آزادی کے بعد (یوپی: نکھار پبلی کیشنز، ۱۹۸۱ء)، ص ۲۸۔۔

۸. ڈاکٹر سلطانہ بخش، پاکستانی اہل قلم خواتین :ایک ادبی جائزہ (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، س۔ن)، ص ۲۵۳۔

۹. ڈاکٹر ممتاز احمد خان، آزادی کے بعد اردو ناول :ہیئت ،اسالیب اور رجحانات (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۷)، ص ۱۳۵۔

۱۰. الطاف فاطمہ، نشان محفل (لاہور: دارالبلاغ، س ن)، ص ۴۲۔

۱۱. ایضاً، ص ۳۹۴۔

۱۲. ایضاً، ص ۴۲۷۔

۱۳. رشید احمد گوریجہ، اردو میں تاریخی ناول (لاہور: البلاغ، ۱۹۹۶ء)، ص ۴۸۳۔

۱۴. ڈاکٹر سلطانہ بخش، پاکستانی اہل قلم خواتین :ایک ادبی جائزہ (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، س۔ن)، ص ۲۵۳۔

۱۵. الطاف فاطمہ، دستک نہ دو (لاہور: فیروز سنز، س۔ن)، ص ۶۷۷۔

۱۶. ایضاً، ص ۶۹۰۔

۱۷. ایضاً، ص ۲۳۶۔

۱۸. صفدر محمود، پاکستان کیوں ٹوٹا (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، س۔ن)، ص ۱۴۔

۱۹. ایضاً، ص ۱۸۔

۲۰. شاہد رشید، "مشرقی پاکستان کی علیحدگی: اسباب و وجوہات"، روزنامہ نوائے وقت، دسمبر ۲۰۱۷۔

۲۱. ڈاکٹر نجمہ صدیق،پاکستانی خواتین کے رجحان ساز ناول (لاہور: اظہار سنز،۲۰۰۸)،ص ۲۴۸۔

۲۲. الطاف فاطمہ،چلتا مسافر(لاہور:جمہوری پبلیکیشنز،۲۰۱۶)،ص۲۵۔

۲۳. ڈاکٹر ممتاز احمد،آزادی کے بعد اردو ناول:ہیئت،اسالیب اور رجحانات،ص۱۳۵۔۱۳۶۔

۲۴. الطاف فاطمہ،چلتا مسافر(لاہور:جمہوری پبلیکیشنز،۲۰۱۶)،ص۲۵۔

۲۵. الطاف فاطمہ،خواب گر(لاہور:جمہوری پبلیکیشنز،۲۰۱۶ء)،ص۲۰۷۔

۲۶. ایضاً،ص۹۔

۲۷. ایضاً،ص۱۱۵۔

۲۸. ایضاً،ص۱۱۵۔

۲۹. عظمت رباب،ڈاکٹر،محمد خان اشرف،ڈاکٹر،"آزادی کا تصور،ہجرت اور چلتا مسافر"،مشمولہ نور تحقیق ج۲،ش۷۔(جولائی تا ستمبر ۲۰۱۸ء):ص۸۳۔

باب سوم:

الطاف فاطمہ کے ناولوں کے مرد کرداروں کی مثالی تذکیری صفات کا تجزیاتی مطالعہ

باب سوم:

الطاف فاطمہ کے ناولوں کے مرد کرداروں کی مثالی تذکیری صفات کا تجزیاتی مطالعہ

ناول کی اساس کہانی ہوتی ہے اور کرداروں کے بغیر کہانی وجود میں نہیں آتی۔ناول نگار کہانی کو پیش کرنے کے لیے مختلف فنی حربوں کا استعمال کرتا ہے۔ان حربوں میں سے کردار کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے کیوں کہ کرداروں کے ذریعے ہی ناول نگار کہانی کے واقعات کو ترتیب دیتا ہے۔اس لیے کردار ناول کا ناگزیر رکن ہے۔کہانی ایک طرح کا عمل یا فعل ہے اور اس عمل کو کرنے کے لیے کردار کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا کردار ہی کہانی کو آگے بڑھانے کا اہم ترین ذریعہ ہیں۔کردار اور واقعات کے حوالے سے ہمیشہ یہ مشکل رہی ہے کہ آیا ناول کے ان دونوں عناصر میں سے کس کو کس پر فوقیت حاصل ہے؟اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں عناصر پلاٹ کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتے ہیں لہٰذا یہ دونوں عناصر لازم وملزوم ہیں۔واقعات کردار کی عدم موجودگی میں رونما نہیں ہو سکتے۔اس حوالے سے ڈاکٹر اسلم آزاد لکھتے ہیں:

> واقعات افراد واقعات کے بغیر رونما نہیں ہوتے۔ارضی ماحول سے متعلق واقعات کی پیشکش کے لیے تو افراد کی ضرورت ہوتی ہے۔فرضی واقعات بھی افراد کے بغیر پیش نہیں کیے جاسکتے۔ناول نگار اپنے قصے میں واقعات کا جو ماحول بیان کرتا ہے اس کے کردار بھی اسی ماحول سے ماخوذ ہوتے ہیں۔۔۔۔ناول نگار جس طبقے،معیار اور انداز و مزاج کی زندگی کو اپنا موضوع بناتا ہے کردار بھی اسی طبقے،معیار اور انداز و مزاج کی ترجمانی کرتے ہیں۔[1]

اسلم آزاد صاحب کی اس بات سے کردار کی اہمیت واضح ہوتی ہے کہ فرضی واقعات بھی کردار کے بغیر پیش نہیں کیے جاسکتے۔

ناول نگار اپنے ذاتی واجتماعی تجربات کے ذریعے کرداروں کو تخلیق کرتا ہے لہٰذا کردار نگاری کی ایک شرط یہ ہے کہ قاری ان کرداروں سے اجنبیت محسوس نہ کرے یہ کردار حقیقی زندگی سے قریب ترین ہوں۔ناول نگار کے لیے لازم ہے کہ وہ کردار کو اس کی تمام بشری خوبیوں و خامیوں کے ساتھ پیش کرے۔وہ اس کے مزاج،عادات و اطوار،خواہشات،اس کی نفسیاتی الجھنوں اور اس کی انفرادی صلاحیت و قابلیت کی بھی تشخیص کرے تاکہ جب کردار

میں اپنے ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے حالات وواقعات کے ساتھ تبدیلی رونما ہو تو قاری کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ ناول نگار کے لیے لازم ہے کہ وہ زندگی کے جیتے جاگتے کرداروں کو پیش کرے۔ ناول کے کرداروں کے متعلق سہیل بخاری لکھتے ہیں:

> ناول کے کرداروں ہی سے ہماری دلچسپی اور ہمدردی کا ایک سبب یہ ہے کہ ان میں ہم اپنی اپنی جانی پہچانی شخصیت کا پرتو دیکھ لیتے ہیں۔ ناول نگار کرداروں کو اپنی تخیلیت کی مدد سے ایک مثالی نمونہ بنا کر پیش کرتا ہے چنانچہ جو صفت اور خصوصیت ہم میں معمولی حد تک پائی جاتی ہے۔ وہ ان میں بدرجہ اتم ملتی ہے۔ اس کے علاوہ جتنی خصوصیات بہت سے آدمیوں میں فرداً فرداً نظر آتی ہیں وہ سب کی سب ایک ہی کردار میں مجتمع ہو جاتی ہیں۔ ایک کردار سے مختلف انسانوں کو جو ہمدردی ہو جاتی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی ذات کا کچھ حصہ اس میں پا لیتا ہے۔[۲]

گویا ناول کے کرداروں سے قاری کے تعلق کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ کردار اس کے جانے پہچانے ہوتے ہیں اُس کے اپنے معاشرے کا حصہ ہوتے ہیں اور اسے ان میں اپنا عکس نظر آتا ہے۔

عام طور پر افسانوی ادب میں کرداروں کو دو بنیادی اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے:

۱۔ سپاٹ کردار

۲۔ پہلو دار کردار

سپاٹ یا سادہ کردار میں حرکت و عمل مفقود ہوتے ہیں۔ یہ کردار آغاز سے انجام تک ایک جیسے ہوتے ہیں ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آتی۔ ان کی شخصیت جمود کا شکار ہوتی ہے۔ یہ کردار اپنا سفر دیگر کرداروں کے ساتھ جاری تو رکھتے ہیں مگر یہ زندگی کے بدلتے ہوئے تناظر کا ساتھ دینے سے قاصر ہوتے ہیں کیوں کہ ان کرداروں میں زندگی کے کسی خاص سانچے میں ڈھلنے کے بعد پختگی آچکی ہوتی ہے۔ یہ کردار حالات کے تحت تبدیل نہیں ہوتے۔ اردو ناول کا ارتقا میں "عظیم الشان صدیقی" لکھتے ہیں:

> سپاٹ یا سادہ کردار کسی خاص مقصد کے تحت تخلیق کیے جاتے ہیں۔ ان میں کردار کی کسی خاص صفت پر زور دیا جاتا ہے اگر وہ نیک ہے تو شروع سے آخر تک نیک ہی رہتا ہے۔ اگر بد ہیں تو یہ بدی بھی آخر تک قائم رہتی ہے۔ یہ اپنی زندگی کا صرف ایک پہلو ہی اجاگر کرنے پر قادر ہوتے ہیں ان کی پختگی و پائیداری اس بات کی اجازت نہیں دیتیں کہ وہ حادثات اور واقعات سے متاثر ہو سکیں یا دوسروں کو متاثر کر سکیں۔[۳]

مکمل یا پہلو دار کردار متحرک کردار ہوتے ہیں۔ جو وقت کے ساتھ اپنی شخصیت میں تبدیلی لاتے رہتے ہیں۔ ان میں خود کو حالات کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ ان کی یہی خوبی ناول میں جان ڈالتی ہے۔ یہ کردار مختلف خوبیوں کے حامل ہوتے ہیں:

> مکمل کردار انھیں کو کہا جاسکتا ہے جو متعدد انسانی خصوصیات رکھتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ کئی انفرادی خصوصیات بھی۔ وہ ناول نگار زیادہ کامیاب سمجھا جاتا ہے جس کے یہاں زیادہ تر اس قسم کے کردار ہوں۔[۴]

گویا پہلو دار یا متحرک کردار کی انفرادی خصوصیت یہی ہے کہ یہ کردار قاری کو اپنی شخصیت کی وجہ سے تجسس میں مبتلا رکھتے ہیں۔

الطاف فاطمہ کے ناولوں کے زیادہ تر کردار مؤخر الذکر کردار سے تعلق رکھتے ہیں جن میں اپنے آپ کو وقت سے ساتھ ساتھ تبدیل کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے وہ جمود کا شکار نہیں ہوتے بلکہ متحرک کردار ہوتے ہیں۔ ان میں بہت سی انسانی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اس باب میں الطاف فاطمہ کے ناولوں کے مرد کرداروں کے تذکیری خصائص کا تجزیہ کیا جائے گا۔

نشان محفل:

سید نادر حسین:

سید نادر حسین ناول کا مرکزی کردار ہے۔ ناول کی کہانی نادر حسین کے گھرانے کے گرد گھومتی ہے۔ سید نادر حسین فنون لطیفہ کا طالب علم ہے۔ وہ انگلستان اعلیٰ تعلیم کے لیے جاتا ہے اور وہاں سے پی ایچ ڈی کر کے آنے کے بعد لکھنؤ میں پروفیسر کی حیثیت سے ملازمت کرتا ہے۔ اس کا تعلق یوپی کے ایک سفید پوش گھرانے سے ہے۔ یہ شریف النفس اور سادہ مزاج کا مالک ہے۔ انگلستان میں اس کی ملاقات اس کے دوست بوب کی بہن روبینا سے ہوئی۔ نادر نے اس سے نتائج کے بارے میں سوچے سمجھے بغیر شادی کر لی۔ یہ سترہ سالہ لڑکی تخیلاتی دنیا میں جیتی اور شاہانہ عادات و اطوار رکھتی تھی۔ اس نے ہندوستان کے متعلق اپنے ایک رشتہ دار انکل اینڈی سے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ وہ جب نادر کو دیکھتی ہے تو اس کی شخصیت سے بہت متاثر ہوتی ہے۔ وہ اسے اس کے پہناوے اور طور طریقوں سے مہاراجہ لگتا ہے۔ اسی لیے وہ اپنے اس خوابوں کے شہزادے سے شادی کر کے ہندوستان آجاتی ہے۔ اس کا خیال ہوتا ہے کہ وہ غلام ملک میں مہارانیوں کی طرح رہے گی۔ نادر اور اس کے گھر والوں نے شادی کے بعد اس کی تمام ضروریات کا خیال رکھا۔ اور اسے ہر سہولت مہیا کرنے کی کوشش کی۔ مگر روبینا کو یہاں ہمیشہ اجنبیت اور اپنی کم مائیگی کا احساس رہتا ہے۔ اس لیے وہ نادر سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اسے الگ گھر لے کر دے تاکہ وہ اپنی مرضی کی پر سکون زندگی بسر کر

سکے۔ نادر لکھنؤ میں اس لیے علیحدہ گھر نہیں لیتا کہ اس سے اس کی ماں اور بہن کو دکھ ہو گا اور وہ انہیں دکھی نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے اپنا تبادلہ الہ آباد کروالیتا ہے۔ وہ روبینا کا خیال رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> کتنی خاطر کرتا تھا وہ اس کی۔ وہ ایک لحظہ کے لیے فراموش نہیں کرتا تھا کہ یہ سب کو چھوڑ کر صرف اس کی خاطر یہاں آئی ہے۔ اس کے دل کو آبگینے سے بھی زیادہ نازک سمجھتا تھا۔ صرف اس کی خاطر بہتوں سے بیگانہ ہوا جا رہا ہے۔[۵]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نادر صرف بیرونی معاملات کو ہی نہیں دیکھتا بلکہ اس نے اپنے گھریلو حالات کو بھی بہتر بنانے کی پوری کوشش کی۔ اس میں یہ احساس موجود ہے کہ روبینا اپنے رشتوں کو، اپنے ملک کو چھوڑ کر تن تنہا اس کے ساتھ آئی ہے تو اس کا خیال کرنا اس پر لازم ہے۔ اور وہی اس کی خوشیوں کا ضامن ہے۔ اس کی محبّت میں گہرائی ہے۔ مگر وہ اس کا کھل کر اظہار نہیں کرتا۔ رابرٹ ووڈ کی تھیوری کے مطابق مثالی مرد وہ ہے جو ذہنی و تخلیقی ہر لحاظ سے بہتر ہو۔ نادر کا کردار بھی ایسا ہی ہے۔ وہ تمام معاملات کو بہتر طریقے سے سر انجام دینے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ تمام رشتوں کو خوش رکھتا ہے۔ اس میں دوسروں کی خاطر جینے کے جذبات موجود ہیں۔ ذہنی لحاظ سے بہتر ہونے کی بات کی جائے تو وہ فنونِ لطیفہ کا طالب علم ہونے کی بنا پر پر فلسفہ پر گہری نظر رکھتا ہے۔ اس کا ایک مقصد "فلسفہ جمال" پر کتاب لکھنا بھی ہے۔ جس کے لیے وہ دن رات محنت کرتا ہے۔ اسے اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کی لگن ہے اور مرنے سے پہلے اس نے اپنی کتاب مکمل کر لی۔ نادر کے کردار کے متعلق سید جاوید اختر لکھتے ہیں:

> نادر ایک سنجیدہ اور اور خود دار انسان ہے۔ وہ ہمیشہ دوسروں کے لیے سوچتا اور ان ہی کے لیے جیتا ہے۔ اس کی محبت میں گھمبیرتا ہے مگر وہ اسے ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ اسی لیے وہ روبینہ سے اظہار محبت نہیں کرتا۔ اسے اپنی ہمشیرہ رابعہ، ماں اور خاندانی روایات سے بھی گہرا جذباتی لگاؤ ہے۔ باوجود یہ کہ وہ مغربی فضاؤں کا تربیت یافتہ ہے اس کا دل مشرقی ہے اور لکھنوی تہذیب کا متوالا۔ اسے اپنے آبائی مکان، امرود کے پیڑ۔ ایک ایک کونے کھدرے سے انس ہے۔ وہ اپنے شاگردوں اور ملازموں تک کو چاہتا ہے۔ اس کے مزاج میں گوندھا گیا محبت کا یہی خمیر۔ ہمیں اس سے محبت کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔[۶]

سید جاوید اختر کی رائے کے مطابق نادر کی محبت میں گھمبیرتا ہے مگر وہ اسے ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ اسی لیے وہ روبینا سے اظہار محبت نہیں کرتا۔ اس رائے کو اگر تذکیری نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو مرد کے لیے ہمارے معاشرے کا متعین کردہ رویہ یہ ہے کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار نہ کرے چاہے وہ خوشی، غم، دکھ، خوف یا محبت کے جذبات ہوں۔ اس حوالے سے نادر کا کردار بھی اپنے جذبات پر قابو رکھتا ہے۔ وہ زبان سے اس کا اظہار نہیں کرتا مگر اس کے عمل سے اس کے جذبات کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ وہ اس کے لیے تمام سہولیات میسر کرتا ہے۔ اس کے لیے خود کو

بدل ڈالتا ہے۔ اگرچہ وہ پر سکون اور خاموش زندگی کا خوگر ہے مگر اس کی خوشنودی کی خاطر کلب میں بھی جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اس کی ماں سے یہ کہہ کر آیا تھا کہ تم دعا کرنا میں تمھاری بیٹی کو خوش رکھ سکوں۔

نادر اپنے شاگردوں سے محبت کرتا ہے اور پڑھائی میں مدد کی خاطر اپنے چند طالب علموں کو گھر پر بلاتا ہے۔ ان میں ایک شاگرد ایبک ہے۔ جس سے نادر کو بہت محبت اور جذباتی لگاؤ ہوتا ہے۔ نادر جانتا ہے کہ یہ لڑکا بہت ذہین ہے مگر اپنے ماں باپ کی محبت سے محروم ہے۔ اس لیے نادر اس کا بہت خیال رکھتا ہے۔ ایبک کو نادر کے گھر میں یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے گھر میں ہے۔ نادر ہمیشہ اس کا اپنی اولاد کی طرح خیال رکھتا ہے۔ سردیوں کی راتوں میں جب ایبک نادر سے پڑھ کر گھر جانے لگتا ہے تو نادر اسے مفلر لپیٹنے اور کوٹ کے بٹن بند کرنے کا کہتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ لُو کے موسم میں آجائے تو اسے منع کرتا ہے کہ اس طرح وہ بیمار ہو سکتا ہے اور اس سے اس کے امتحانات پر اثر پڑ سکتا ہے۔ غرض نادر میں ایبک کے لیے ہمدردی اور محبت کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ نادر کے لکھنؤ جانے کے بعد ایبک اور روبینا میں رفتہ رفتہ محبت پروان چڑھنے لگی۔ اگرچہ ایبک نے بہت کوشش کی کہ وہ روبینا سے دور رہے مگر روبینا کی ہر ممکن کوشش رہی کہ وہ اسے اپنے سے دور نہ جانے دے۔ ایبک اس وجہ سے ذہنی کشمکش سے دوچار رہا۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ نادر اس پر اعتماد کرتا ہے اور اس پر اپنی محبت نچھاور کرتا ہے۔ اس لیے وہ نہیں چاہتا کہ اتنے شریف اور بلند کردار کے مالک کے لیے رسوائی کا باعث بنے مگر محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے نادر کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی اور روبینا نے اس سے بے وفائی کی۔ اس کے باوجود نادر نے تشدد کا رویہ اختیار نہیں کیا۔ اس حوالے سے نادر سوچتا ہے:

> کاش میں تمہارے جیسا ہوتا۔ لیکن میری پشت پر صدیوں کی ثقافت اور تمدن کا بھاری بوجھ لدا ہوا تھا۔ ان ہاتھوں نے انسانی خون سے رنگین ہونا نہیں سیکھا ہے۔ ان انگلیوں نے کسی جسم کو ضرر نہیں پہنچایا ہے۔ اس دل و دماغ میں انسانی جان کی قیمت کا بڑا تصور بٹھایا گیا ہے۔ اس زبان کو شیریں گفتاری کی تلقین کی گئی ہے۔ اس نے سربازار کسی کی پگڑی نہیں اچھالی ہے۔ میاں ہماری تو تربیت ہی غلط ہے۔ ہم واقعی مذاق اڑانے کے قابل ہیں۔[۷]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نادر ایک تہذیب یافتہ گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی تربیت نہایت مہذب انداز میں ہوئی ہے۔ وہ کسی کو نقصان پہنچانا نہیں جانتا۔ اس کے نزدیک انسان کی اور اس کی عزت کی بڑی قدر و منزلت ہے۔ وہ بے ضرر انسان ہے۔ وہ روبینا اور ایبک کے معاملے میں تشدد کا رویہ اختیار نہیں کرتا۔ حالانکہ ایسے معاملات میں مرد غیرت کے نام پر عورت کے ساتھ ساتھ مرد کو بھی قتل کر دیتے ہیں مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے مطابق تشدد کو روکنا تذکیریت کے خصائص میں شامل ہے۔ ایسا کردار ہیرو کہلانے کا مستحق ہے۔ جب کہ غیر تذکیری کردار تشدد کی تلاش کرتا ہے۔ وہ وولن ہوتا ہے۔ اس حوالے سے دیکھا

جائے تو نادر کے کردار میں تشدد کو روکنے یا اختیار نہ کرنے کی خصوصیت موجود ہے۔ وہ نہایت ہمت و حوصلے سے کام لیتے ہوئے خاموشی سے روبینا کو طلاق دیتا ہے اور ساتھ ہی اس کے اخراجات کے لیے کچھ رقم دے کر اس کی مدد کرتا ہے۔ نادر حسین نے اپنی غیرت مندی کی وجہ سے روبینا کو طلاق دی۔ حالانکہ وہ جب اس کو شملہ لینے گیا تو اس نے روبینا کی پسند کا روغن گھر میں کروایا۔ اس کے لیے نئے ریکارڈ خریدے۔ آنے سے قبل اس کو خط کے ذریعے اطلاع دی۔ وہ خوشی خوشی اسے لینے گیا۔ اسے اس بات کی امید تھی کہ روبینا اس سے بہت محبت اور چاؤ سے ملے گی۔ مگر وہ روبینا کی سرد مہری دیکھ کر حیران ہوا اور اس نے اس کی خوشی کو ختم کر دیا۔ نادر کو روبینا کی بے وفائی سے زیادہ دکھ ایبک کا اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے پر ہوا۔ وہ اس سے باپ کی طرح محبت کرتا تھا۔ اس واقعہ سے نادر کو بہت دکھ اور تکلیف ہوئی۔ جیسے اس کی دنیا ہی اجڑ گئی۔ دراصل وہ اعلیٰ اقدار کا پاس رکھنے والا مخلص شخص تھا۔ اگر وہ چاہتا تو روبینا کو طلاق نہ دیتا اور اس پر تشدد کرتا۔ ایبک سے جا کر لڑتا مگر اس کی تربیت یہ سب کرنا گوارا نہیں کرتی۔ اس نے اس غم کو دل میں پوشیدہ رکھا اور یہی غم خاموشی سے اس کی جان لے گیا۔ حالانکہ وہ پہلے سے بیمار تھا مگر یہ چوٹ کھانے کے بات اس میں جینے کی امنگ ختم ہو گئی۔ بدرہ خاتون نادر کے کردار کے متعلق لکھتی ہیں:

> نادر حسین فنون لطیفہ کا طالب علم ہے۔ یہ ایک غیرت مند کردار ہے۔ روبینہ ایک مغرب نژاد عورت ہے جو شوہر کی موجودگی میں دوسرے مردوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی پھرتی ہے۔ نادر حسین جو کہ ایک مشرقی نوجوان ہے، اپنی بیوی کی بے حیائی سے دلبرداشتہ ہو کر اسے طلاق دے دیتا ہے۔ اور یہی باحیا مشرقی کردار کی فطری خصوصیت ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کردار کی تشکیل میں الطاف فاطمہ نے کلی طور پر انصاف برتا ہے۔[8]

نادر میں مدد کرنے کے جذبات بھی موجود ہیں۔ وہ اپنے شاگردوں، ملازموں سب کی مدد کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اعلیٰ اخلاق کے سب ہی قائل ہیں۔ چاہے وہ اس کے ملازم ہوں، خانزادہ گل نواز ہوں یا اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے والا شاگرد ہو یا اس کی بے وفا بیوی۔ تمام لوگ اس کی نیک سیرتی اور اعلیٰ اخلاق کے قائل ہیں۔ اس کے ملازم اس سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور اس کی زندگی کی دعا کرتے ہیں۔ جب نادر کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ملازم رگھو کے بیٹے لچھمنا کی شادی ہے تو وہ سوچتا ہے کہ اسے بھی اسے کچھ دینا چاہیئے اور وہ پیسے کے ذریعے سے اس کی مالی مدد کرتا ہے۔ وہ حشمت بوا سے کہتا ہے کہ:

> بوا اس کی شادی میں مجھے بھی تو کچھ دینا چاہیے۔ تم اس کی بہو کے لیے چاندی کے زیور اور جوڑے کا تو انتظام کر لو اور رگھو کو روپے میں دے دوں گا۔ اے تم سلامت رہو۔ سب کا خیال کرنے والے۔ حشمت نے چٹ چٹ اس کی بلائیں لے لیں۔[9]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نادر کا کردار سب کا خیال رکھنے والا اور مدد کرنے والا ہے۔ رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے مطابق مدد کرنا، دوسروں کی درست ہنمائی کرنا بھی تذکیری خصوصیات ہیں اور نادر کے کردار میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔ مگر اس کی ایک خامی یہ ہے کہ اس نے لوگوں پر اندھا اعتماد کیا اور یہی اعتماد اس کی زندگی میں مشکلات کا سبب بنا۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو نادر کا کردار ہر لحاظ سے بہتر ہے وہ ذہنی صلاحیت اور اعلیٰ اخلاق کا مالک ہے، دوسروں کی مدد کرنا اور تشدد کو روکنا جیسے تذکیری خصائص کا حامل ہے۔

ایبک:

ایبک نادر کا شاگرد ہے۔ اس کردار میں غیر تذکیری رویہ پایا جاتا ہے۔ یہ لاابالی فطرت کا مالک ہے۔ یہ پٹھان ہے مگر اس کی فطرت پٹھانوں سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اسے اشتعال انگیزی سے نفرت ہے۔ اس کی طبیعت اور مزاج میں نرمی پائی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب اس کا باپ پالتو کتے کے پاگل ہونے پر اسے گولی مارتا ہے تو اس پر وہ غمگین ہوتا ہے۔ اور جب وہ اپنے علاقے کے ایک نوجوان لڑکے گل شیر کی لاش کے ٹکڑے دیکھتا ہے تو وہ دلبرداشتہ ہو کر اپنا شہر چھوڑ دیتا ہے اور الٰہ آباد میں آکر پڑھائی شروع کرتا ہے۔

ایبک ہمیشہ ماں باپ کی محبت سے محروم رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا باپ عیش و عشرت کی زندگی گزارنے اور کم سن لڑکیوں سے شادیاں کرنے میں مصروف رہا۔ وہ ایبک کو وہ محبت اور پیار نہ دے سکا جس کی اولاد کو ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی ماں اپنی سوکنوں کے مسائل اور ضروریات کو پورا کرنے میں لگی رہی اور اسے محبت نہ دے پائی۔ ان تمام چیزوں نے ایبک کو محبت سے محروم کر دیا اور تمام عمر اس کے اندر محبت سے محرومی کا احساس رہا۔ اسی محبت کو پانے کی خاطر اس نے زندگی میں غلط فیصلے کیے جس کی وجہ سے اس کو مشکلات کا سامنا رہا۔

ایبک پڑھائی کرنے کے لیے الٰہ آباد جاتا ہے تو اس کا استاد نادر اس کی ذہانت کو دیکھ کر اس کی رہنمائی کی خاطر اور دیگر شاگردوں کو اپنے گھر پر ہی بلا کر ان کو سمجھاتا ہے۔ گھنٹوں بیٹھ کر ان کے درمیان کسی نہ کسی موضوع پر بحث ہوتی۔ ایبک نادر کا پر اعتماد اور خاص شاگرد ہے۔ اسی لیے جب وہ گھر پر نہیں ہوتا تو وہ اپنے گھر کی ذمہ داریاں ایبک کے سپرد کر دیتا ہے۔ نادر کو ایبک سے جذباتی لگاؤ ہے۔ وہ اس کا خیال اپنے بچوں کی طرح رکھتا ہے جیسے کہ اس نے سردی میں بٹن کیوں کھولے۔ لو میں اس طرح کیوں چلا آیا۔ اس وجہ سے وہ بیمار ہو سکتا ہے۔ اس کا اثر اس کے امتحانات پر پڑ سکتا ہے۔ یہی وہ توجہ ہے جس کا ایبک ہمیشہ سے خواہش مند رہا اور ایبک کے نزدیک نادر کی محبت بھری روک ٹوک کا بدل دنیا کی دیگر کوئی چیز نہیں۔ نادر کی بیوی روبینا جو کہ مغربی خاتون ہے۔ جب ایبک کو دیکھتی ہے تو اسے اس کے بچپن کا دوست بل یاد آجاتا ہے کیونکہ اس کی شکل پٹھان ہونے کی وجہ سے بل سے مشابہت رکھتی ہے۔ وہ

ایبک کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ نادر جب لکھنؤ میں ہوتا ہے تو ایبک نادر کے گھر آتا جاتا رہتا ہے اور روبینا کو ایبک کی بے فکر اور لاابالی شخصیت متاثر کرتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ایبک ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ وہ ڈاکٹر نادر کے اعتماد کو قائم رکھے۔ وہ اس حوالے سے ذہنی الجھن کا شکار رہتا ہے اور اسی لیے اپنی پڑھائی چھوڑ کر اپنے ماموں کے پاس چائل چلا جاتا ہے۔ ادھر ایبک کے غم میں روبینا بیمار ہو جاتی ہے ڈاکٹر کے کہنے پر نادر روبینا کو شملہ لے جاتا ہے جہاں اتفاق سے ان کی ملاقات ایبک سے ہوتی ہے۔ ایبک نے جس قدر ان سے دور رہنے کی کوشش کی قسمت پھر سے انہیں سامنے لے آئی۔ دوبارہ سے ایبک اور روبینا میں راہ و رسم بڑھنے لگی ایبک کو روبینا کا مزاج اپنے مزاج سے مشترک محسوس ہوا۔ اسے اس بات کا احساس ہونے لگا کہ وہ روبینا سے محض جذباتی لگاؤ نہیں رکھتا بلکہ اس سے محبت کرتا ہے۔ مگر نادر کی محبت، شرافت، نیک سیرتی اور سادگی آڑے آجاتی ہے۔ جو ایبک کو بے سکون کر دیتی ہے۔ اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا رہتا ہے کہ وہ ایک محبت کرنے والے شریف انسان کو کیسے دھوکا دے سکتا ہے۔ وہ کیسے اتنا ذلیل ہو سکتا ہے۔ مگر اس کی محبت اور جذبے کی شدت نے اسے ہر چیز سے بے نیاز کر دیا۔ وہ نہ تو اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتا ہے اور نہ ہی اپنے حال کی فکر کرتا ہے وہ اکثر پریشانی کے عالم میں سوچتا ہے:

> آہ ڈاکٹر نادر کاش یہ تمہارا بیچ نہ ہوتا۔ یقین جانو مجھے تم سے بے حد عقیدت ہے اور محبت ہے۔ کاش تم اتنے شریف اور اس قدر بلند نہ ہوتے کہ پستیاں اور ذلت تمہارے پاس آتے ہوئے شرماتی ہیں۔ کاش تمہاری بیوی اس قدر حسین اور غیر ذمہ دار نہ ہوتی۔ مگر ہر وہ بات جو کہ کاش نہ ہوتی، اپنی جگہ پر زندہ اور ٹھوس حقیقت ہے۔ [۱۰]

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایبک نادر سے بہت عقیدت و محبت رکھتا ہے مگر وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہے اور اپنے جذبات پر مزید قابو پانے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور نادر کو دھوکا دیتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں مردوں کے حوالے سے دو طرح کے رویے پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ لوگ ہیں جو تشدد اور برائی کو روکتے ہیں اور دوسرے وہ لوگ ہیں جو تشدد اور برائی کو پھیلاتے ہیں۔ اس بات کی وضاحت رابرٹ ووڈ اپنی تھیوری میں ایک کردار شین کی مثال دے کر کرتا ہے۔ شین ایک فارم پر کام کرتا ہے ہے یہ اتنا پرکشش ہے کہ کھیت کے مالک کی بیوی اس کی محبت میں مبتلا ہو گئی اور شین نے اس خاندان جس نے اسے پالا اسے نقصان پہنچانے کے بجائے کھیت چھوڑ دیا۔ یہاں شین اپنے مالکوں کی عزت کا خیال رکھتا ہے اور ایمان داری سے کام لیتے ہوئے وہاں سے چلا جاتا ہے یہی واقعہ نشان محفل میں ایبک کے کردار کے ذریعے بھی پیش کیا گیا۔ مگر ایبک نے اپنے استاد کی عزت کا خیال نہ کیا اور اس کا اعتبار کھو دیا۔ اس وجہ سے نادر اندرونی طور پر ٹوٹ سا گیا۔ اس کا گھر تباہ و برباد ہو گیا۔ محمود کی زندگی مشکلات کا شکار ہو گئی اور وہ ماں باپ کی محبت سے محروم ہو گیا۔ اس طرح یہ ہنستا بستا گھرانہ تباہ ہو گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایبک نے یہاں

تشدد اور برائی کے راستے کو اختیار کیا ہے جو کہ ایک غیر تذکیری رویہ ہے۔ یہ مثالی مرد کے کردار پر پورا نہیں اترتا کیوں کہ مثالی مرد تشدد اور برائی کو روکتا ہے۔ جب کہ غیر مثالی مرد یعنی ولن تشدد اور برائی کو پھیلاتا ہے۔

ان تمام واقعات کے تناظر میں دیکھا جائے تو ایبک کے ایسا کرنے کی ایک وجہ اس کی ماں سے محبت کی محرومی بھی ہے۔ ماں سے محبت کی محرومی اس کے لیے تشنگی کا باعث بنتی ہے۔ ایبک کا ہمیشہ یہی خیال رہا ہے کہ اس کی ماں اس کو نظر انداز کر کے اپنی سوتنوں اور اس کے بچوں کی فکر میں مبتلا رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب روبینا ایبک کی فکر کرتی ہے اس کی چھوٹی چھوٹی ضروریات کا خیال کرتی ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کی فکر کرنے والا بھی کوئی ہے اور اس طرح سے وہ اپنی مامتا کی کمی کو پورا کرتا ہے۔ لیکن جب اسے اس کے ماموں خانزادہ گل نواز اس کی ماں خانم کا خط اسے پڑھواتے ہیں۔ جس میں اس کی ماں لکھتی ہے کہ وہ ہر گھڑی ایبک کی سلامتی کے لیے دعا گو رہی ہے۔ وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اس کے لیے دعا کرتی رہی ہے کہ وہ کسی بھی پریشانی میں مبتلا نہ ہو تو ایبک کو یہ بات غم زدہ کر دیتی ہے کہ اس کی ماں اس سے کتنی محبت کرتی ہے کاش اسے پہلے یہ معلوم ہو جاتا تو وہ یہ انتہائی قدم نہ اٹھاتا اور اپنی ماں کی آغوش میں سر رکھ کر اپنے تمام رنج و غم سے نجات حاصل کرتا۔

یہاں ایبک کی حقیقت پسندی کے پہلو کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ ایبک روبینا سے محبت کرتا ہے مگر وہ روبینا کو سمجھاتا ہے۔ وہ اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ بے روزگار ہے اور وہ روبینا کو تمام سہولیات زندگی فراہم نہیں کر سکتا جو کہ نادر نے اسے فراہم کی ہیں۔ وہ اس حقیقت سے واقف ہے کہ زندگی محض محبت کے سہارے نہیں گزرتی بلکہ انسانی ضروریات زندگی کا اہم حصہ ہیں۔ اس حوالے سے ایبک روبینا سے کہتا ہے:

> ایسی غلطی نہ کر بیٹھنا۔ میں بالکل نکھٹو اور بے روزگار ہوں۔ وہ سونے کا ڈلا ہے۔ تم کو عیش کروا رہا ہے۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ مجھے عیش کی پرواہ نہیں۔ اچھی طرح دل پر ہاتھ رکھ کر بات کرو۔ تم ایسی غیر ذمہ دار بات کیوں کر رہی ہو۔ تم لوگ یہاں آ کر عیش کرنا اپنا حق سمجھتے ہو۔ یہاں آ کر تم لوگ تکلیف نہیں اٹھا سکتے۔ سوچ لو تمہارے بھلے کی کہتا ہوں۔[11]

وہ اس حقیقت سے واقف ہے کہ روبینا آقاؤں کی قوم سے تعلق رکھتی ہے اور یہاں کی رعایا کو اپنا محکوم سمجھتی ہے۔ ان لوگوں کی سوچ یہی ہوتی ہے کہ وہ یہاں پر عیش کی زندگی بسر کریں گے۔ ایبک اسی لیے روبینا کو یہ تمام باتیں سوچنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ مگر وہ ان تمام باتوں کی پرواہ نہیں کرتی۔

ایبک کے مزاج میں تُرش روئی ہے جو کہ اسے وراثت میں ملی ہے۔ اگرچہ وہ اشتعال انگیزی سے نفرت کرتا ہے مگر وہ نادر کی طرح روبینا کی لاپرواہی اور بے اعتدالی کو پسند نہیں کرتا۔ اسی لیے وہ روبینا کے ساتھ روایتی مردوں کا سا سلوک رکھتا ہے وہ اپنی محبت میں کسی کو شریک کرنے کا حق نہیں دینا چاہے وہ روبینا کی اپنے بیٹے کے لیے محبت ہو یا پھر نادر کی یاد کی صورت میں ہو۔ وہ اکثر بے روزگاری اور گھریلو اخراجات پورے نہ کر سکنے کے باعث جھنجھلاہٹ کا

شکار ہوتا ہے اور پھر تشدد کا رویہ اختیار کرتے ہوئے روبینا کو مارتا پیٹتا اور گالیاں دیتا ہے اور پھر بعد میں اپنی بد سلوکی کی معافیاں مانگتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اندر سے کھوکھلا انسان ہے۔

ایبک کے کردار میں خودداری جیسی صفت بھی پائی جاتی ہے۔ جب روبینا سے شادی پر اس کی ماں اس سے ناراض ہو کر تعلق ختم کر دیتی ہے اور ایبک کا خرچ بند ہو جاتا ہے تو ایبک اپنے حالات خراب ہونے کے باوجود ان سے رجوع نہیں کرتا بلکہ اولاد ہونے پر اس کے اندر احساس ذمہ داری پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ملازمت کی تلاش میں پھرتا ہے۔ وہ پاکستان آنے کے بعد کسی بھی غلط طریقے سے یا سفارش کے ذریعے ملازمت حاصل نہیں کرنا چاہتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پٹھانوں میں خودداری جیسی صفات پائی جاتی ہیں اور پٹھانوں سے مختلف ہونے کے باوجود بھی ان کی عادات واطوار کسی نہ کسی صورت میں اس کی ذات میں پائی جاتی ہیں۔

اس کا ضمیر ہمیشہ اسے ملامت کرتا رہتا ہے کہ نادر کا ہنستا بستا گھر اس کی وجہ سے تباہ ہوا۔ اسی وجہ سے وہ محمود پر پڑھائی کے معاملے میں سختی کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ایک عالم اور پڑھے لکھے باپ کا بیٹا نکما اور ان پڑھ نہ رہ جائے۔ جس کی زندگی کا سکون اس کی وجہ سے برباد ہوا ہے۔ یہی احساس ہے جس کی وجہ سے اس نے محمود کو اپنے پاس رکھا۔

رابرٹ ووڈ اپنی تھیوری میں بیان کرتے ہیں کہ بچوں، بڑوں، مردوں اور عورتوں کی مدد کرنا بھی تذکیری خصوصیات میں شامل ہے اگرچہ ایبک کا کردار نہایت بد مزاج دکھایا گیا ہے مگر ہجرت کے موقع پر اس کے مزاج میں خاصی تبدیلی آئی اور وہ سنجیدہ اور خاموش ہو گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب ہر شخص اپنی ذات اور اپنی ضروریات کے متعلق سوچتا ہے مگر ایبک کا کردار ایسا نہیں ہے اس میں مدد کرنے کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ جب ناظم صاحب کی بیگم روبینا سے پانی مانگنے آئی تو اس نے انکار کر دیا یہ کہہ کر کے اس کے ساتھ بچے ہیں اور یہ ان کی ضرورت کے لیے کافی ہے مگر ایبک اس کو پانی دیتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ میں آپ کو آپ کا گھڑا بھر کر لا دیتا ہوں۔ وہ انکار کرتی ہے تو ایبک کہتا ہے:

> واہ یہ بھی کوئی بات ہے، آپ لوٹے میں پانی لیجیے اور چلیے اپنا گھڑا مجھے دے دیجیے۔ یہ وقت انکار و تکلف کا نہ تھا۔ ایبک ان کے پیچھے پیچھے گھڑا لینے چلا گیا۔
>
> اور جب وہ اپنے کندھے پر گھڑا رکھے ہوئے۔۔۔۔ قریب آیا تو انھوں نے کہا بڑی تکلیف دی میں نے آپ کو۔
>
> کوئی تکلیف نہیں آپ کا میرے اوپر احسان ہے۔ آپ کو جس کام کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ انھوں نے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا دراز قد اور دیوتاؤں کی طرح حسین۔ اے ہے کس قدر اچھا اخلاق ہے وہ دل میں سوچ رہی تھیں [۱۲]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایبک کے کردار میں مدد کرنا جیسی تذکیری صفت پائی جاتی ہے۔ وہ ایک اچھے اخلاق کا مالک ہے مگر حالات کی ستم ظریفی نے اسے بے حس بنا دیا۔

ایبک کی بیماری اور معاشی تنگدستی کی وجہ سے جب روبینا ایبک سے طلاق کا مطالبہ کرتی ہے تو ایبک نادر کی طرح ہمت نہیں ہارتا بلکہ روبینا کی اس بیماری سے نفرت ایبک کے اندر جینے کی لگن پیدا کرتی ہے۔ اور وہ ہمت و حوصلے سے اس بیماری کا مقابلہ کرتا ہے اور ٹی بی جیسی بیماری کو مات دے کر تندرست ہو جاتا ہے۔ یہاں ایبک میں ہمت و حوصلہ جیسی صفت کو دکھایا گیا ہے۔ اس حوالے سے سہیل بخاری لکھتے ہیں: "مصنف نے نادر اور ایبک کے کرداروں کا خوب موازنہ کیا ہے۔ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح تھک کر گر پڑتا ہے اور پھر اٹھ نہیں پاتا۔ دوسرا بھی تھک کر گرتا ہے لیکن پھر ایک عزم کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوتا ہے"۔[۱۳]

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ایبک مثالی آدمی کے کردار پر پورا نہیں اترتا کیوں کہ اس میں برائی اور تشدد کا رویہ پایا جاتا ہے مگر اس کے باوجود اس میں چند تذکیری خصائص بھی موجود ہیں جس میں خودداری، حقیقت پسندی ،ہمت و حوصلہ اور دوسروں کی مدد کرنا جیسے خصائص شامل ہیں۔

محمود:

محمود بھی ناول کا اہم کردار ہے۔ یہ نادر حسین کا بیٹا ہے۔ ماں باپ، پھوپھی اور دادی کا لاڈلا بچہ ہونے کی وجہ سے اسے بچپن میں بہت پیار ملا۔ مگر حالات کی ستم ظریفی کے سبب وہ دربدر ہو گیا۔ بچپن ہی میں ماں باپ کی علیحدگی کے سبب اس کی زندگی بہت مشکل ہو گئی اور ان دونوں کی طلاق نے اسے ماں باپ کی محبت سے محروم کر دیا۔ طلاق کے بعد نادر نے اسے کانوینٹ سکول میں داخل کروا دیا جہاں سے اپنے باپ نادر کے مرنے کی خبر ملی تو اس کے ذہن میں عجیب سی ہلچل ہوئی اس میں یہ ڈر پیدا ہو گیا کہ اس کی ماں بھی مر نہ جائے۔ جب کہ وہ ایک عرصے سے ان کی محبت سے محروم رہا۔ قیام پاکستان کے بعد جب سکول والے بچوں کو پاکستان روانہ کرتے ہیں تو روبینا اور ایبک اسے اسٹیشن پر لینے جاتے ہیں اس کے بعد وہ ان دونوں کے ساتھ رہتا ہے۔ جب ایبک اپنے بیٹے ہمایوں کو پیار کرتا ہے تو محمود کے دل پر گزرنے والی کیفیت کو الطاف فاطمہ نے اس طرح بیان کیا ہے:

> اس نے کڑھ کر سوچا یہ ایبک بھائی کا لڑکا ہے۔ ایبک بھائی اس سے زیادہ پیار کریں گے مجھے پہلے کی طرح کہانیاں تھوڑی سنائیں گے۔ اس رات اس کو میویو، یوجین اور زبیر کے علاوہ سسٹر سیلیا تک یاد آئے۔[۱۴]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمود کے اندر احساس محرومی ہے مگر وہ اس پر صبر کرتا ہے۔ ماں باپ سے دوری نے اسے کم گو، سنجیدہ اور صابر بنا دیا۔ وہ اپنے جذبات پر قابو رکھتا ہے اور کسی پر عیاں نہیں کرتا کہ وہ کیا محسوس

کر رہا ہے۔ رابرٹ ووڈ کی تھیوری میں صبر اور جذبات پر قابو پانا جیسے تذکیری خصائص کو بیان کیا گیا ہے اور محمود کے کردار میں یہ خصائص موجود ہیں۔ یہاں یہ دکھایا گیا ہے کہ وہ بچہ ہوتے ہوئے بھی اپنے جذبات اور دلی کیفیات کا اظہار نہیں کرتا۔ بچے کو جب بچپن میں بہت لاڈ پیار ملتا ہے تو اس کی عادتیں بگڑ جاتی ہیں مگر محمود کا کردار ایسا نہیں ہے وہ اپنی ماں کے پاس آنے کے بعد بھی اس سے کوئی ضد اور کسی قسم کی شکایت نہیں کرتا اس کے اندر ایبک یا اس کے بچوں کے لیے نفرت کا جذبہ نہیں پایا جاتا ہے بلکہ وہ ان کا خیال رکھتا ہے۔ جب کے عام زندگی میں دیکھا جائے تو اس طرح کے واقعات کا بچوں پر بہت برا اثر پڑتا ہے اور ان کے اندر بدلہ لینے کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے مگر محمود کا کردار ایسا نہیں ہے وہ تشدد اور برائی کو فروغ نہیں دیتا:

> محمود صبح سویرے ناشتے کے بعد اپنی شکستہ قمیض، خاکی نیکر اور لال رنگ کے ٹینس شو پہن کر آدھی تہائی کتابیں اٹھائے سکول چلا جاتا اور سارے دن کے بعد شام کا بھوکا پیاسا گھستا تو بھی مچل کر یا ضد کر کے کھانے کو نہیں مانگتا۔ خاموش، کسی طرف کھیلنے لگتا۔ دونوں بچوں سے وہ بڑی نرمی اور خیال سے پیش آتا نوکر سے وہ کبھی کام کو نہ کہتا تھا۔ ایبک کے سامنے ہفتوں نہ پڑتا۔ بالکل ایسا لگتا کہ وہ وقت نکال رہا ہے گویا کہتا ہو چند کی بات اور ہے۔[۱۵]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمود کو بچپن سے ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا وہ ایک ذہین بچہ تھا اور اس نے اسکول میں بہت جلد ترقی کی تھی مگر ہجرت کے سبب تعلیم کا وہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ یہاں ایبک کی بے روزگاری کے سبب فیس دینا مشکل ہو گیا۔ روبینا اس کی دو ماہ کی فیس ادا نہیں کرتی۔ جس کی وجہ سے فادر اس کو مارتا ہے۔ محمود اسی وجہ سے سکول سے غیر حاضر ہوتا ہے۔ مگر ایبک اسے دیکھ لیتا ہے اور اس پر وہ اسے بہت مارتا ہے۔ تب جا کر محمود ایبک کو بتاتا ہے کہ اس کی ماں نے دو ماہ کی فیس ادا نہیں کی۔ یہاں بھی روبینا کا عیش پسند رویہ دکھایا گیا ہے کہ ایک ماں کے لیے اولاد کی تعلیم سے زیادہ ضروری کپڑے بنانا تھا۔ الطاف فاطمہ نے محمود کے کردار کے ذریعے ایک یتیم بچے کی مشکلات اور ذہنی کیفیات کی تصویر کشی کی ہے۔

محمود نے تمام عمر مشکلات میں گزاری۔ اس کی تربیت نہیں کی گئی اور نہ ہی اسے زندگی کی قدریں سکھائی گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی کتابیں بیچ کر اور ماں کے پیسے چرا کر سینما دیکھا، لڑائیاں لڑیں۔ مگر چوں کہ وہ ایک شریف باپ کا بیٹا تھا شاید اسی لیے وہ جلد ہی ان تمام حرکتوں سے باز آ گیا۔ اس نے تعلیم حاصل کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔ اس کے لیے محنت کی۔ ٹیوشنیں پڑھائیں۔ وہ اپنی ٹیوشن کے پیسوں سے اپنی سوتیلی بہن ہما کے لیے گڑیا اور مٹھائی خرید کر لاتا اور اس کا بہت خیال کرتا اس سے اس کی اعلیٰ ظرفی کا اندازہ ہوتا ہے کہ ایبک جس نے اس کا خاندان تباہ کر دیا وہ اس کی اولاد کا بھی خیال کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ ایک اعلیٰ ظرف شخص کا بیٹا ہے اور یہ صفات اس کے خون میں شامل ہیں۔ محمود نے مشکل حالات کا ہمت و جواں مردی سے مقابلہ کیا اور تعلیم

حاصل کرلی اور نیوی کی انجینئرنگ لائن میں بھرتی ہوا۔ محمود کا تعلیم حاصل کرنا اور کسی منزل پر پہنچنا ناممکن سا دکھائی دیتا ہے مگر ان مشکل حالات، معاشی تنگ دستی کے باوجود اور رضا کی مدد کے سہارے محمود نے یہ مقام حاصل کیا۔ محمود کے کردار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زندگی کے پیچ وخم نے اس کی تعمیر و تشکیل کی ہے۔ اس میں تذکیریت کے خصائص موجود ہیں۔ زندگی نے اسے سنجیدہ، کم گو اور صابر شخص بنا دیا۔ جب وہ اپنی پھوپھی رابعہ سے ملتا ہے تو اس کا رویہ اس کی فطرت کی عکاسی کرتا ہے: "آنسو بہانا محمود کی عادت نہ تھی۔ وہ بڑا حلیم اور صابر لڑکا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں اور فرط جذبات سے سرخ ہو رہی تھیں اور وہ کھسیائی سی ہنسی ہنس رہا تھا۔"[16]

رابرٹ ووڈ اپنی تھیوری میں بیان کرتا ہے کہ مرد مشکل حالات کا ہمت اور جواں مردی سے مقابلہ کرتا ہے، وہ صبر کرنے والا ہوتا ہے اور اپنے جذبات پر قابو پانا جانتا ہے۔ اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمود میں وہ تذکیری خصائص موجود ہیں جس کا تھیوری میں ذکر کیا گیا ہے۔ وہ روتا نہیں ہے اسے اپنے جذبات پر قابو پانا آتا ہے ۔ دراصل یہ ہمارے معاشرے کے متعین کردہ رویے ہیں۔ محمود نے اپنی زندگی کے تجربات سے یہ سب سیکھا۔ لہٰذا مشکل حالات کا ہمت سے مقابلہ کرنا، صبر کرنا اور اپنے جذبات پر قابو رکھنا جیسے خصائص محمود کے کردار میں موجود ہیں۔

اویناش:

اویناش نادر کا دوست ہے۔ اس کی شخصیت پُر کشش ہے۔ وہ ہندو ہے مگر مذہبی تعصبات سے بالاتر ہو کر سوچتا ہے۔ ناول میں اویناش کا تعارف ایک خط کے ذریعے ہوتا ہے۔ جس میں وہ نادر، رابعہ اور روبینا کو آگرے آنے کی دعوت دیتا ہے۔ اویناش کے اس دعوت نامے کو مصنفہ نے مسخرے سے پر خلوص بلاوے کا نام دیا ہے۔ اویناش اپنی ملازمت کے سلسلے میں آگرہ میں رہتا ہے۔ بنگالی کھادی کا کرتا اور دھوتی پہنتا ہے۔ اس کا گھر قدیم طرز کا ہے مگر اس قدامت میں بھی جدت نظر آتی ہے۔ یہ ہنر مند بھی ہے اس نے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے فرنیچر میز، کرسیوں اور لیمپ سے سجایا۔ اس سے اس کی تخلیقی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ ایک دلچسپ اور غیر معمولی شخص ہے۔ صاف دل کا انسان ہے اور اس کے ہر انداز سے مسخرا پن چھلکتا ہے۔ اسے اپنے دوستوں سے بے حد محبت ہے۔ اویناش بینا سے محبت کرتا ہے مگر وہ اس کا اظہار نہیں کرتا۔ دراصل یہ ایک سماجی رویہ ہے جذباتی حوالے سے خواتین کو کمزور جب کہ مرد کو مضبوط سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ ہمارا معاشرہ مردوں کے لیے اپنے جذبات خواہ وہ محبت کے ہوں، خوف کے یا اداسی کے ان کا اظہار نہ کرنے کا رویہ متعین کرتا ہے۔ یہ ایک تذکیری خصوصیت ہے۔ اویناش اگرچہ اپنی زبان سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کرتا مگر اس کا انداز اس کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ اقتباس درج ذیل ہے:

اویناش اس کو بہت دلچسپ نظر آیا۔ وہ اس پر خوب رعب جماتا تھا، اور اتنا ہی خیال رکھتا تھا لیکن اس کی ہر ادا سے ظاہر تھا کہ اس کی ہر نگاہ اور ہر جذبہ بینا کے لیے وقف ہے جس کو ظاہر کرنے کی وہ ضرورت نہیں سمجھتا۔[۱۷]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جسمانی حرکات و انداز بھی زبان کے مترادف ہوتے ہیں۔ مزید یہ کہ وہ اپنے جذبات پر قابو پانا جانتا ہے۔ رابرٹ ووڈ کی تھیوری کے مطابق اویناش میں یہ تذکیری خصوصیت پائی جاتی ہے۔ اویناش عقل مند اور ہوشیار آدمی ہے۔ روبینا کی بے تکلفی دیکھ کر اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ روبینا اس میں دلچسپی لے رہی ہے اور اس کی توجہ بینا کے بجائے اپنی طرف کرنے کی کوشش میں رہتی ہے۔ مگر اویناش چوں کہ نادر کا دوست ہے اور اس سے جذباتی لگاؤ رکھتا ہے وہ اپنے دوست کو دھوکا دے کر اس کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ اسی لیے اپنے مسخرے سے انداز کے ذریعے ہمیشہ روبینا کو یاد دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اس کے دوست کی بیوی ہے۔ جیسا کہ رابرٹ ووڈ نے اپنی تھیوری میں شین کے ذریعے مثالی کردار کی وضاحت کی ہے۔ جو ایک کھیت میں کام کرتا ہے اور کھیت کے مالک کی بیوی اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے تو شین اپنے مالک کو دھوکا دے کر اس کی عزت کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا اس لیے وہ کھیت کو چھوڑ دیتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں دو طرح کے رویے پائے جاتے ہیں ایک تشدد اور برائی کا، دوسرا تشدد کو روکنے اور بھلائی کو فروغ دینے کا۔ اویناش کا کردار مؤخر الذکر کردار سے مطابقت رکھتا ہے جو کہ تذکیری کردار ہے جب کہ ایبک کا کردار اول الذکر رویے کے مطابق ہے جو تھیوری کے مطابق غیر تذکیری رویہ ہے۔

اویناش قیافہ شناس ہے۔ روبینا کا ہاتھ دیکھ کر اس کے چہرے پر پریشانی کا تاثر ابھرتا ہے مگر وہ اسے محسوس نہیں ہونے دیتا بلکہ نہایت سنجیدگی سے روبینا کی رہنمائی کرتا ہے اور اسے نرمی سے سمجھاتا ہے:

نادر تمہارا بہترین ساتھی ہے۔ اس کی قدر کرنا، ہیرے کو پرکھنا تو جوہریکا کام ہے، پھر بھی اگر ہیرے کے مقابل پتھر آجائے تو اناڑی بھی پہچان سکتا ہے۔ ہیرے کو پرکھنے کی اہلیت نہ ہو تو پتھر ہی کو پہچاننا سیکھ لو۔[۱۸]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اویناش روبینا کا ہاتھ دیکھ کر اس کے مزاج اور اس کی آنے والی زندگی میں ایک مشکل مرحلے کو جان گیا ہے اسی لیے وہ روبینا کو اس انداز میں سمجھاتا ہے تاکہ وہ نادر سے بے وفائی نہ کرے اور اپنی اور نادر کی زندگی کو تباہ و برباد ہونے سے بچائے۔ اویناش ایک حقیقت پسند انسان بھی ہے۔ وہ اس حقیقت سے واقف ہے کہ اس کی بیوی بینا نادر سے محبت کرتی ہے مگر وہ اس کی محبت کا احترام کرتا ہے۔ اس لیے کہ اس کی محبت میں خود غرضی نہیں پائی جاتی۔ اس لیے جب نادر کی بیماری کی اطلاع ملتی ہے تو وہ بینا کو خود نادر کی مدد کے لیے روانہ

کرتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ وہ نادر کو اپنے ساتھ لے آئے۔ اس میں رقابت کا جذبہ نہیں پایا جاتا۔ وہ ایک اعلیٰ ظرف انسان ہے اس لیے اس کا کردار ناول میں اگرچہ مختصر ہے مگر اہمیت کا حامل ہے۔

اویناش مذہبی تعصبات سے بالاتر ہو کر سوچتا ہے۔ اس میں انسان دوستی اور مدد کرنے کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ وہ ہجرت کے موقع پر نادر کے بیٹے محمود کو اپنی تحویل میں لینا چاہتا ہے مگر چوں کہ وہ ہندو ہے اور محمود مسلمان۔ اس لیے مذہب کی وجہ سے محمود کو اس کی تحویل میں نہیں دیا جاتا اور اس پر وہ چیخ چیخ کر روتا ہے۔ کیوں کہ انسانوں کے اس طرح بدلتے ہوئے تیور ایک حساس آدمی کے لیے انتہائی کرب ناک ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ کہتا ہے: "تم سچ کہتی ہو انسان اس حد تک ذلیل ہو چکا ہے کہ اس کا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ تم نے ٹھیک کیا کہ اسے چھوڑ آئیں۔"[۱۹]

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے مطابق اویناش کے کردار میں جذبات پر قابو رکھنا، درست رہنمائی کرنا اور مدد کرنا جیسے تذکیری خصائص موجود ہیں۔ اس لیے یہ کردار ناول میں اہمیت کا حامل ہے۔

خانزادہ گل نواز:

خانزادہ گل نواز ایبک کے ماموں ہیں۔ یہ پڑھے لکھے اور خاموش طبع انسان ہیں۔ یہ شملہ کے نواحی علاقے سنوگ کے ایک خوب صورت کاٹیج میں رہتے ہیں۔ اور بے فکری سے اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ انھیں اپنے بھانجے ایبک سے بہت محبت ہے۔ اسی لیے وہ اس کا داخلہ علی گڑھ میں کرواتے ہیں مگر وہ وہاں سے الٰہ آباد چلا جاتا ہے۔ وہ اپنے بھانجے کے غیر مستقل مزاج کی وجہ سے اس کے متعلق بہت فکر مند رہتے ہیں۔ انھیں عمدہ نسل کے کتے پالنے کا شوق ہے اور یہی ان کا کاروبار بھی ہے۔ خانزادہ ایک کاروباری اور اصول پرست انسان ہے۔ وہ کسی سے بھی دیے گئے وقت کے علاوہ ملاقات نہیں کرتے۔ اسی لیے جب نادر کو وہ راج کمار اجے سنگھ سمجھے تو انھوں نے کہا کہ وہ اس وقت مصروف ہیں اور بات نہیں کر سکتے کیوں کہ انھوں نے اسے ملاقات کے لیے بدھ کے روز چار بجے کا وقت دیا ہے۔ مگر جب انھیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایبک کا پروفیسر نادر ہے تو ان کا انداز یکسر بدل جاتا ہے۔ وہ ان کی اچھے طریقے سے مہمان نوازی کرتے ہیں۔ ان سے نہایت دلچسپ انداز میں گفتگو کرتے ہیں، ان کی گفتگو بھی معلومات سے پُر ہے۔ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں اپنے علاقے سے دور رہنے کے باوجود پٹھانوں کی صفات موجود ہیں۔ پٹھانوں کے حوالے سے یہ بات مشہور ہے کہ وہ اپنے مہمانوں کی دل و جان سے حفاظت اور مہمان نوازی کرتے ہیں۔ خانزادہ کی شخصیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک جاندار شخصیت کے مالک ہیں ان میں کھوکھلا پن نہیں پایا

جاتا۔ روبینا اور نادر دونوں خانزادہ سے متاثر ہوتے ہیں اور یہ بھی ایک تذکیری خصوصیت ہے کہ کسی گروہ میں قابل ستائش جگہ حاصل کرنا اور ان کو اپنا گرویدہ بنانا۔ خانزادہ میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔

خانزادہ گل نواز معاملہ فہم شخص ہیں۔ روبینا کے ان کے گھر میں آکر رکنے اور پھر ایبک کے گھر سے غائب ہو جانے پر وہ بھانپ لیتے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان محبت کا معاملہ چل رہا ہے۔ اسی لیے وہ روبینا کے گھر ایبک کو خط بھجواتے ہیں کہ وہ گھر آئے انھیں اس سے ضروری بات کرنی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ روبینا کے شوہر کی غیر موجودگی میں ایبک اس کے گھر ہے۔ جب ایبک گھر آیا تو وہ شرمندہ اور گھبرایا ہوا تھا۔ خانزادہ گل نواز اس سے بالکل عام سے انداز میں گفتگو کرتے ہیں وہ نہ ہی اسے شرمندہ کرنا چاہتے ہیں اور نہ ہی برہم بلکہ ان کا مقصد ایبک کی اصلاح اور رہنمائی ہے۔ وہ اس بات سے واقف ہیں کہ آج کل کی نوجوان نسل کے مزاج بہت ہی نازک اور تُند ہیں وہ خلاف توقع بات سننے پر چھوٹے بڑے کی تمیز بھول جاتے ہیں۔ اس لیے خانزادہ گل نواز نے نہایت سوچے سمجھے انداز میں ایبک سے بات کی۔ وہ نہیں جانتے کہ اس کا ایبک پر کیا اثر پڑے گا مگر وہ اس کی رہنمائی کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنے آگے کی زندگی میں مشکلات کا شکار نہ ہو اور نہ ہی کسی دوسرے شخص کی زندگی برباد کرے۔ وہ اسے سمجھاتے ہیں کہ کسی شادی شدہ خاتون سے محبت کرنے کے اچھے نتائج سامنے نہیں آتے۔ اس لیے بہتر ہے کہ وہ یکسوئی اختیار کرے۔ اس حوالے سے خانزادہ اسے کہتے ہیں:

> میں کیا کرتا! فرض کرو میں تم کو بتا بھی دوں تو تم کو کیا نفع ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر تم پوچھتے ہی ہو تو میں یہ فیصلہ اس تیسرے شخص کے مزاج اور شخصیت کے لحاظ سے کرتا۔ انسان ہر شخص کے لیے اپنے جذبات کی قربانی نہیں دے سکتا۔ لیکن بعض رشتے اور انسان ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے لیے ایثار کے سوا کچھ بن نہیں پڑتا۔ میرا سابقہ نادر جیسے انسان سے ہوتا اور وہی تعلق ہوتا جو تمہارا اس سے ہے تو میں یقیناً اس کے راستے سے ہٹ جاتا۔[20]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خانزادہ گل نواز رشتوں کے تقدس کو پامال نہیں ہونے دینا چاہتے۔ انھیں نادر سے دلی ہمدردی ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ ایبک کے غلط قدم اٹھانے سے ان کا گھرانہ تباہ و برباد ہو اور اس کی عزت پر کوئی آنچ آئے۔ اسی لیے وہ ایبک کو سمجھاتے ہیں۔ رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے مطابق مثالی آدمی کی ایک تذکیری خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ دوسروں کی مدد اور درست رہنمائی کرتا ہے اور بھلائی کو فروغ دیتا ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو خانزادہ گل نواز ایبک کی رہنمائی کر کے اسے تشدد اور برائی کرنے سے روکتے ہیں لہٰذا یہ ان کی تذکیری صفت ہے۔

پٹھانوں سے مہمان نوازی، پردہ، اخلاص، غیرت اور وطن دوستی جیسی صفات وابستہ ہیں۔ خانزادہ گل نواز بھی اپنے وطن سے محبت کرتے ہیں اور سنوگ چھوڑنے کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ وہ قیام پاکستان میں ہونے

والے فسادات کے موقع پر انگلستان چلے گئے مگر وہ جب واپس آئے تو ان کے گھر کے حالات بدل گئے۔ ان کی پہلے جیسی آن بان باقی نہ رہی۔ اس کے گھر کے حالات:

> گھر کے آدھے حصے میں شرنار تھی آباد تھے۔ پرانا مالی مر گیا تھا۔ باغ کی بہاریں ختم ہو گئی تھیں۔ کتوں کا کاروبار ختم ہو چکا تھا۔ کتوں کے قدر دان گئے۔ وہ افسوس سے کہتے تھے۔ ان کے باغ اور دونوں کاٹیج کسٹوڈین کے قبضہ میں تھے۔ اپنے مکان کے چند کمروں میں وہ ایک مسافر کی طرح رہ رہے تھے۔ مگر تھے اتنے ضدی کہ قیامت صغریٰ بھی انھیں اپنی جگہ سے نہ ہلا سکی۔[۲۱]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی جڑیں اس زمین سے پیوستہ تھیں۔ وہ اپنے ہی گھر میں دو کمروں تک محدود ہو گئے مگر اپنا گھر نہ چھوڑا۔ بلکہ ہمت اور صبر سے کام لیا۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو خانزادہ گل نواز کا کردار مکمل شخصیت کا مالک ہے ان میں دوسروں کو متاثر کرنے کی صلاحیت بھی موجود ہے اور وہ تشدد اور برائی کو روکتے ہیں، دوسروں کی درست رہنمائی کرتے ہیں اور صبر و ہمت جیسے تذکیری خصائص ان کے کردار کا حصہ ہیں۔

نشان محفل کے دو ہی مردانہ کردار اہم ہیں نادر اور ایبک۔ مگر دوسرے کردار بھی متاثر کرنے والے ہیں۔ جن میں محمود، نادر کا دوست اویناش، خانزادہ گل نواز اور عادل کا کردار شامل ہیں۔ عادل کا کردار ناول میں بالکل مختصر ہے۔ یہ نادر کے ماموں کا بیٹا ہے۔ جو تعلیم یافتہ ہے اور جس میں قومی ہمدردی کا جذبہ موجود ہے۔ وہ ایک آسودہ حال زندگی گزار رہا ہے۔ اس کی شخصیت میں خلوص، شرافت اور قومی ہمدردی جیسی صفات موجود ہیں۔ غرض نشان محفل کے مردانہ کرداروں میں تذکیری خصائص موجود ہیں مگر ایبک کا کردار ایسا ہے کہ غیر تذکیری ہونے کے باوجود اس میں چند تذکیری خصائص پائے جاتے ہیں۔

دستک نہ دو:

صفدر یاسین:

صفدر یاسین ناول "دستک نہ دو" کا مرکزی مرد کردار ہے۔ یہ چین کا باشندہ ہے۔ اس کردار کے ذریعے الطاف فاطمہ نے چینی تمدن کی وضاحت بھی کی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب چین ابھی آزاد نہ ہوا تھا بلکہ مفلسی کا شکار تھا۔ صفدر یاسین ایک عالم کا بیٹا ہے اور پڑھے لکھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ وہ خاندان ہے جو غربت کے باوجود اپنے رشتہ داروں کی کفالت کرتا ہے اور اسے اپنا فرض سمجھتا ہے۔ اس حوالے سے صفدر یاسین یہ سوچتا ہے کہ خوش حالی کے دنوں میں تو یہ ایک خوش کُن فرض ہو گا مگر جب معاشی بدحالی ہو تو یہ فرض زندگی کا المیہ بن جاتا ہے۔ یاسین لیو صفدر کا باپ اور اس کے بعد صفدر یاسین محنت و مشقت کر کے اپنے رشتہ داروں کی کفالت کرتے ہیں۔ صفدر لیو چو کا باپ عالم ہونے کے سبب اپنی تقاریر کے ذریعے عوام کو اس بات سے آگاہ کرتا کہ ان کی فلاکت و غربت کا سبب غیر

ملکی تسلط ہے یہ وہ زمانہ تھا جب اس طرح کی بات کرنا جرم سمجھا جاتا تھا۔ صفدر کے باپ کو قید کر لیا گیا۔ بعد ازاں اسے مار دیا گیا۔ صفدر نے ان تمام حالات پر صبر و ہمت کا مظاہرہ کیا۔ صفدر یاسین میں احساس ذمہ داری پایا جاتا ہے۔ والد کی وفات کے بعد وہ اپنی غریب ماں، بہنوں اور مفلس رشتہ داروں کا پیٹ پالنے کی غرض سے مارا مارا پھرتا رہا۔ اسے چھوٹی سی عمر میں ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے ان حالات کا ہمت و بہادری سے سامنا کیا اور اپنی ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے نبھانے کی کوشش کی:

> صفدر نے کالج چھوڑ دیا۔ بوسیدہ سے نیلے کوٹ اور پاجامے میں وہ کام کی تلاش میں سرگرداں پھرا۔ آخر ایک دن شنگھائی سے جو جہاز چائے، سلک اور چاول لے کر انگلستان کو جا رہا تھا۔ اس پر قلیوں میں ملازم ہو کر وہ وہاں جا پہنچا۔ پھر وہاں سے ایک چینی تاجر اس کو لے کر کراچی پہنچا تھا۔ اور وہاں سے سانگ لے اڑا۔ دو سال تک نہ جانے کہاں کہاں خود بھی گھوما اور اس کو بھی گھمایا۔ آخر یہاں آ کر دم لیا۔ اور یوں اس مختصر سے سن و سال میں صفدر کا تجربہ خاصہ وسیع ہو چکا تھا۔[۲۲]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صفدر یاسین نے نو عمری میں ہی بے شمار مشکلات کا سامنا کیا۔ انسان کے کردار کا اندازہ اس کے عمل اور اس کی خصوصیات کو دیکھ کر لگایا جاتا ہے۔ انسان کی زندگی کے مختلف ادوار ہوتے ہیں بچپن، جوانی اور بڑھاپا۔ ہر دور میں اس کا عمل اس کی عمر کے حساب سے مختلف ہوتا ہے۔ صفدر یاسین کے کردار کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ بچپن ہی سے محنت و مشقت کرتا ہے۔ اس کردار میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ وہ خاندان کا کفیل ہے۔ جب کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ لڑکے اس عمر میں مشکلات یا ذمہ داریوں کو دیکھ کر بے راہ روی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ ذہنی و جسمانی آسودگی چاہتے ہیں۔ وہ کسی بھی الجھن اور ذمہ داریوں کے متحمل نہیں ہوتے۔ اگر ایسا ہو تو وہ فرار کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ مگر صفدر یاسین کا کردار ایسا نہیں ہے اس میں مثبت سوچ پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے اہل خانہ اور رشتہ داروں کا کفیل ہے اس لیے وہ دن رات محنت و مشقت کرتا ہے اور صبر سے کام لیتے ہوئے مشکل حالات کا جواں مردی سے مقابلہ کرتا ہے۔ رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے مطابق مشکل حالات کا جواں مردی سے مقابلہ کرنا، صبر اور بہادری تذکیری خصوصیات ہیں۔

صفدر یاسین ہندوستان میں ایک چینی تاجر سانگ کے ہاں ملازمت کی۔ وہ دکان پر کام کرنے کے ساتھ ساتھ چینی دستکاری کا سامان لے کر پھیری لگاتا ہے اور امرا کی بیگمات اس سے یہ مصنوعات بڑا بھاؤ تاؤ کر کے خریدتی ہیں۔ یہ بہت محنتی اور ایمان دار شخص ہے۔ اس نے کبھی بھی اپنے مالک کو غیر ذمہ داری کا ثبوت نہ دیا اور ایمان داری سے اپنا کام سرانجام دیتا رہا۔ سانگ اسے ہر ماہ نوکری سے نکالنے کی دھمکی دیتا مگر ایسا نہ کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے صفدر کی ایمان داری پر مکمل بھروسہ ہے وہ اس کی دکان کا حساب کتاب بھی نہایت دیانت داری سے کرتا۔

صفدر یاسین نے پھیری کے دوران ہی گیتی کو دیکھا۔ جب وہ چھوٹی سی بچی تھی۔ گیتی کی شکل اپنے دوسرے بہن بھائیوں کی نسبت واجبی سی ہے۔ وہ چینیوں سے مشابہت رکھتی ہے۔ چینیوں جیسی ناک اور چھوٹی چھوٹی تکونی آنکھوں والی لڑکی کو دیکھ کر صفدر کو اپنا وطن یاد آگیا۔ جس وجہ سے وہ اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اسے اس سے انسیت کے باعث اس کی پرواہ ہونے لگی۔ صفدر کے اندر مدد کرنے کے جذبات بھی پائے جاتے ہیں۔ جب گیتی درخت سے گرتی ہے اور اس کا ہاتھ فریکچر ہوتا ہے اس وقت بھی صفدر ہی وہاں پہنچتا ہے بعد میں اس کی دل جوئی کی خاطر تپتی دوپہر میں ہسپتال آتا اس کے ساتھ ہنسی مذاق کرتا تاکہ وہ پریشان نہ ہو۔ اسے بھی گیتی کے ساتھ وقت گزار کر ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ اپنے گھر میں وقت گزار کر آیا ہو۔ اس کی شخصیت میں غریب الوطنی کا احساس پایا جاتا ہے۔ اسے اپنے وطن سے بہت محبت ہے اور گیتی کی چینی جیسی شکل دیکھ کر اس کو اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اس کا بے حد خیال رکھتا ہے اور اسے اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ اس لیے ہر موڑ پر اس کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے۔ جیسے جب گیتی اپنی ماں کے ہاتھوں مسعود کی بے عزتی سے دل برداشتہ ہو کر کسی کو بتائے بغیر اکیلی پارک میں جا بیٹھتی ہے تو صفدر اسے وہاں اکیلا دیکھ کر اسے سمجھاتا ہے اور اس کی عزت کی حفاظت کرتے ہوئے اسے گھر تک چھوڑ کے جاتا ہے۔ پھر جب سینما میں وہ اکیلی دوسرے درجے میں بیٹھتی ہے تو وہاں اس کی مدد کو پہنچتا ہے۔ گیتی سے اس کا بار بار ملنا اسے سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ اس کا گیتی کے ساتھ تعلق قدرت کی جانب سے ہے اس لیے وہ اسے اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے:

> اور اب وہ اس کے عقیدے کے مطابق اس کی حفاظت میں اور ذمے داری میں آچکی تھی۔۔۔ اور غلط بخشی کے طور پر ملی ہوئی ذمے داریوں کا نبھانا اور بھی مشکل ہوتا ہے اور مجھے تو شروع ہی سے مشیت نے ذمے داریوں کے نبھانے کے لیے تاک رکھا تھا۔[۲۳]

رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے مطابق مثالی آدمی وہ ہے جو بہادر ہو۔ مشکل حالات کا جواں مردی سے مقابلہ کرے۔ دیگر کرداروں یعنی مردوں، عورتوں اور بچوں کی مدد کرے۔ اور لوگوں کی درست رہنمائی کر سکے۔ صفدر یاسین کا کردار بھی ایسا ہے۔ درست رہنمائی کے حوالے سے دیکھا جائے تو صفدر یاسین نے صولت کی بھی درست رہنمائی کی۔ وہ معاملہ فہم شخص ہے جب وہ صولت کے جہیز کے لیے چیزیں فروخت کرنے گیا تو وہ بھانپ گیا کہ صولت اس شادی سے خوش نہیں ہے۔ وہ صولت کو اس انداز میں سمجھاتا ہے کہ آصف جاہ کو اپنی تقدیر کا لکھا مان کر اس سے شادی کر لے۔ صولت جیسی رکھ رکھاؤ والی لڑکی اس کی باتوں سے مرعوب ہو جاتی ہے اور آصف جاہ سے شادی کو تقدیر کا لکھا مان کر مطمئن ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دوسروں کی مدد کرنا بھی تذکیری صفت ہے جو مثالی آدمی کی پہچان ہے۔ صفدر یاسین گیتی کی مدد کرتا ہے وہ اسے اجنبی شہر میں بے یارو مددگار نہیں چھوڑتا۔ بلکہ اس کے لیے

ٹیوشنوں اور وائی ڈبلیو ڈی میں رہنے کا انتظام کرتا ہے اور اس طرح وہ مطمئن ہو جاتا ہے۔ صفدر یاسین کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ معزز گھرانوں کی لڑکیوں کو اس طرح گھر چھوڑ کر آنے جیسی حرکت زیب نہیں دیتی۔ اس لیے وہ اس کی درست رہنمائی کی کوشش کرتا ہے تاکہ وہ اپنے گھر لوٹ جائے۔ صفدر کی شخصیت کا اندازہ گیتی کی اس سوچ سے لگایا جاسکتا ہے:

> تم ہمیشہ ہی میرے آڑے آئے ہو لیو چو! اب بھی اور جب بھی مجھے تمہاری کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ مجھے تمہارا جلتی دوپہر میں سانگ سے چھپ کر ہسپتال آنا کبھی نہ بھولے گا۔ تب تم محض میری دلداری کی خاطر ہر روز آتے تھے اور محض میری خاطر چچی جان کے لیے پان، چھالیا اور برف جیسے سودے جلتی دوپہر میں لا کر دیا کرتے تھے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس ہماری دنیا کے خود ساختہ اصولوں میں اتنے بہت سے خلوص، نیکی اور محبت کی کوئی قیمت نہیں اگر ہے تو حفظ مراتب کی اور طبقوں کی۔[۲۴]

صفدر کے دل میں گیتی کے لیے محبت کے جذبات ہیں وہ انھیں عیاں نہیں کرتا۔ اس جذبے کو وہ اپنے دل میں پاکیزہ امانت کی طرح چھپا کر رکھتا ہے۔ وہ اپنا احوال دل ایک ڈائری میں لکھتا ہے اور اس کی یہ کیفیت و جذبات ڈائری تک ہی محدود رہتے ہیں۔ وہ اپنی محبت میں مطلب پرست اور خود غرض نہیں ہے وہ اس بات کو بہتر طریقے سے جانتا ہے کہ اس کے اور گیتی کے درمیان سماجی تفریق کی ایک بڑی دیوار حائل ہے جسے عبور کرنا ناممکن ہے۔ اس بات کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:

> مارگریٹ نے دستک دی، اس لیے کہ وہ باریابی کی آرزومند تھی اور رسائی نہ پائی۔ میں نے دستک نہیں دی۔ لیکن اس لیے نہیں کہ میں رسائی چاہتا تھا۔ مجھے اپنا مقسوم معلوم تھا۔ رسائی کے اور میرے درمیان دیوار چین سے بھی زیادہ سنگین اور طویل دیوار حائل تھی۔[۲۵]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی بے لوث محبت خود غرضی سے پاک ہے۔ وہ ہمیشہ گیتی کو خوش دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی لیے جب وہ گیتی کو کرنل سجاد کے ساتھ دیکھتا ہے تو اسے دنیا کی ہر چیز اپنے سے دور جاتی محسوس ہوتی ہے مگر وہ گیتی سے شکوہ نہیں کرتا بلکہ مطمئن رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں ضبط کا پہلو دکھائی دیتا ہے۔ یہ وہی تذکیری رویہ ہے جسے ہمارا معاشرہ ایک مرد کے لیے متعین کرتا ہے کہ مرد اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرتا۔ چاہے وہ جذبات درد کے ہوں، خوف کے یا محبت کے کیوں کہ اس سے ان کی تذکیریت کو نقصان پہنچتا ہے۔

صفدر یاسین کا کردار بھی ایسا ہی ہے وہ تذکیری رویے کو قائم رکھتے ہوئے گیتی سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کرتا۔ رابرٹ ووڈ کی تھیوری کے مطابق مثالی آدمی مکمل پن کی علامت ہوتا ہے یعنی وہ ذہنی، تخلیقی ہر لحاظ سے بہتر ہو۔ بہادر ہو، مشکل حالات کا جواں مردی سے مقابلہ کرے اور دیگر کرداروں کی مدد کے ساتھ درست رہنمائی بھی

کرے اور جسمانی قابلیت کا حامل ہو۔ صفدر یاسین میں تخلیقی صلاحیت موجود ہے۔ وہ شاعری اور مصوری میں دل چسپی رکھتا ہے۔ وہ فارغ اوقات میں پینٹنگ اور مجسمہ سازی بھی کرتا ہے۔ اسے مصوری کر کے تسکین حاصل ہوتی ہے۔ کیوں کہ یہ ایک فن کار بھی ہے اسی لیے اس میں احساسات و جذبات کا عنصر زیادہ پایا جاتا ہے اور وہ سب سے محبت و ہمدردی کرتا ہے۔

سید جاوید اختر صفدر یاسین کے متعلق لکھتے ہیں:

> صفدر یاسین کا کردار غیر معمولی طور پر یادگار اور پر کشش ہے اور الطاف فاطمہ کی فنی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔۔۔ صفدر چوایک پیدائشی فنکار تھا۔ ریشم پر مصوری میں اسے مہارت حاصل تھی ۔اس کا دل دنیا کے تمام فنکاروں کی طرح گداز اور چاہنے والا تھا۔ وہ اپنے قول کا پکا تھا۔ اگر وہ کسی سے کوئی وعدہ کر لیتا تو ہر حالت میں اسے پورا کرتا۔[۲۶]

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو صفدر یاسین کے کردار میں مثالی آدمی کی خصوصیات موجود ہیں۔

بختیار:

بختیار جہانگیر مرزا کا چھوٹا بیٹا ہے۔ یہ پڑھا لکھا شخص ہے اس نے علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی۔ یہ بڑا صابر اور حساس شخصیت کا مالک ہے۔ اس کا کردار ناول میں اپنے والد جہانگیر مرزا کی وفات کے بعد واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ بختیار نے آسودہ اور پر آسائش زندگی بسر کی۔ مگر اس کے باوجود اس کی طبیعت میں کسی قسم کا کوئی بگاڑ پیدا نہ ہوا۔ وہ مہذب اور خوش اخلاق ثابت ہوا۔ اس کی وجہ اس کے والدین کی تربیت ہے۔ بختیار بھی گیتی کی طرح اپنے بہن بھائیوں سے مختلف یعنی ان کی طرح خوب صورت نہیں ہے۔ مگر اس چیز نے اس میں احساس کمتری کو جنم نہیں دیا۔ وہ سادہ اور منکسر المزاج ہے۔ گھر میں اس کی زیادہ اہمیت نہ تھی اور نہ ہی اس نے اپنی اہمیت جتانے کی سعی کی۔ جہانگیر مرزا کا انتقال معاشی حوالے سے زیادہ پریشان کن سانحہ نہ تھا مگر اس کے باپ کے انتقال نے اسے ذہنی آسودگی اور اطمینان سے محروم کر دیا۔ وہ عمر کے جس حصے میں تھا اس عمر میں بچے کو اپنے باپ کی رفاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر نہ تو اس کا باپ رہا اور نہ ہی اس کا بڑا بھائی شہریار موجود تھا جس کی ہمدردی اور توجہ وہ حاصل کر سکتا۔ اسے اس بات پر بہت افسوس تھا کہ اس کے بھائی نے باہر جا کر اس کو بالکل تنہا کر دیا ہے۔ اسے اس بات کا احساس ہے کہ اصل میں اس کا بڑا بھائی ہی اس منصب کے قابل ہے۔ مگر اس نے اپنے باپ کی موت اور بھائی کی غیر موجودگی پر صبر کیا اور بطریق احسن اپنی ذمہ داریوں کو نبھایا۔ بختیار میں صبر اور احساس ذمہ داری جیسے تذکیری خصائص پائے جاتے ہیں۔

رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے مطابق مثالی آدمی وہ ہے جو ہر لحاظ سے بہتر ہو۔ وہ محض زندگی کے ایک پہلو پر توجہ نہ دے بلکہ تمام پہلوؤں پر نظر رکھے اور اپنی ذہنی صلاحیت سے تمام معاملات کو حل کرنے کی کوشش

کرے۔ جیسا کہ مرد کے ذمہ خارجی امور کے ساتھ ساتھ گھریلو ذمہ داریاں نبھانا بھی فرض ہوتی ہیں۔ اگر مرد ان ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے انجام نہ دے سکے تو وہ تذکیری خصائص کا حامل نہیں ہے۔ مگر بختیار کا کردار فرض شناس ثابت ہوا۔ اس نے اپنے باپ کی زمینوں اور بینک کے معاملات کے ساتھ ساتھ گھر کی طرف بھی توجہ دی اور ہر ممکن کوشش کی کہ گھر کے ماحول کو ساز گار بنا سکے۔ بختیار میں ان ذمہ داریوں کی وجہ سے اتنی تبدیلی آئی کہ وہ سنجیدہ اور ذمہ دار شخص بن گیا۔ اس نے اپنی بہنوں کو بڑے بھائی اور گھر کے سربراہ کی حیثیت سے نرم اور مشفقانہ لہجے میں سمجھایا کہ وہ آپسی اتفاق سے گھر کے ماحول کو بہتر بنائیں اور اپنی ماں کا خیال رکھیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ باپ کے انتقال کے بعد اس کے گھر والوں کو کسی مشکل یا پریشانی کا سامنا ہو۔ اس کے لیے اس نے تمام معاملات کو سلجھانے کی کوشش کی۔ یہ اس کی تذکیری خصوصیت ہے۔

بختیار جانتا ہے کہ گیتی کی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ ماں کا اس کے ساتھ سخت رویہ ہے۔ گیتی جب گھر چھوڑ کر لاہور جاتی ہے تو بختیار اسے ڈھونڈتا ہے اور اسے احساس دلاتا ہے کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے وہ اس کے خلاف نہیں ہے۔ وہ گیتی کی نفسیات کو سمجھتا ہے اسی لیے محبت اور شفقت سے اسے سمجھاتا ہے۔ اسے اپنے خاندانی وقار کو برقرار رکھنے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ گیتی کو اس کی الجھنوں سے نکالنے میں اس کی مدد کرتا ہے۔ گیتی بختیار کے حوالے سے سوچتی ہے:

> میں اپنے اس بھائی کی الجھنوں میں ہرگز اضافہ نہیں کروں گی جو اپنی ہر ذمہ داری کو انتہائی خوش اسلوبی سے انجام دینا چاہ رہا ہے۔ میرا بھائی کتنا فراغ دل اور درگزر کرنے والا ہے۔ بختیار بھیا! تمہاری فراخ دلی اور مروت نے میرے پیروں میں زنجیریں ڈال دی ہیں۔[۲۷]

بختیار معاملہ فہم شخص ہے۔ اس نے اپنی عقل مندی سے گیتی کو کالج میں داخل کروایا اور کوشش کی کہ وہ اس احساس سے نکل آئے کہ سب اس سے نفرت کرتے ہیں۔ بختیار کے متعلق پروفیسر کنور نسیم لکھتے ہیں:

> بختیار پڑھا لکھا نوجوان ہے اسے گیتی آراء کی تمام حرکات کا علم ہے اگرچہ وہ کرنل سجاد سے گیتی کے رشتے کو پسند نہیں کرتا لیکن تمام حالات و واقعات کا جائزہ لیتے ہوئے وہ گیتی آرا کی بہتری اسی میں سمجھتا ہے کہ اس کی شادی کرنل سجاد سے کر دی جائے۔ بختیار کا کردار اگرچہ ناول کے وسط سے شروع ہوتا ہے لیکن اس لیے زیادہ اہم ہے کہ گیتی آرا جیسی لڑکی کا گھر بسانے میں اس نے ماں باپ کی طرح فرض ادا کیا ہے۔[۲۸]

تذکیری تھیوری کے حوالے سے مرد عورتوں کی نسبت اپنے جذبات کا اظہار کم کرتے ہیں۔ یہ کہنا کہ مرد کے اندر جذبات نہیں پائے جاتے بالکل غلط ہے۔ مرد بھی انسان ہے اس میں بھی جذبات پائے جاتے ہیں مگر مرد چوں کہ جسمانی اور اعصابی لحاظ سے مضبوط ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرتا۔ اپنے جذبات کو

چھپانا یا اظہار نہ کرنا بھی تذکیری خصائص میں شامل ہے۔ بختیار بھی اپنے والد جہانگیر مرزا کی موت کے غم کو اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے۔ وہ دوسروں پر عیاں نہیں کرتا کہ وہ کتنا افسردہ اور تنہا محسوس کر رہا ہے۔ وہ صبر سے کام لیتا ہے۔ جب اسے اپنے باپ کا خیال آتا ہے تو وہ تکیے میں منھ چھپا کر روتا ہے مگر جب وہ کھانے کی میز پر جاتا ہے تو اس کی آنکھوں کی سرخی کو دیکھ کر اس کی ماں استفسار کرتی ہے کہ اس کی آنکھیں سرخ کیوں ہو رہی ہیں تو وہ کہتا ہے:

> کچھ نہیں ذرا ناوقت آنکھ لگ گئی تھی۔ بختیار نے سر جھکا کر کہا اور پھر سوچا۔ اماں بیگم کا شاید یہ خیال ہے کہ میں اپنے باپ کے لیے آنسو نہیں بہا سکتا اور میری آنکھوں کی سرخی کی کوئی خاص وجہ ہونا چاہیے۔[۲۹]

یہ ہمارے معاشرے کا متعین کردہ رویہ ہے کہ مرد روتا نہیں ہے اور یہ کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار نہ کرے۔ مرد مضبوط اور سخت جان ہوتا ہے مگر دکھ اور تکلیف اس کو بھی ہوتی ہے۔

بختیار اپنے اہل خانہ اور اپنے ملازموں کے لیے اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتا ہے۔ اپنی حساس طبیعت کی وجہ سے وہ اپنے ملازموں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آتا ہے۔ گھر کے اخراجات کو کم کرنے کے حوالے سے اسے کسی ایک ملازم کو برطرف کرنا تھا تو وہ ایسا نہیں کر پایا۔ یہ سوچ کر اس کا دل بے چین اور مضطرب ہو گیا کہ اس گھر کے ملازموں نے اپنی تمام عمر اس گھر پر صرف کی ہے۔ وہ ان کو اب نوکری سے کیسے نکال دے اور انھیں بے یار و مددگار چھوڑ دے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بختیار کے اندر ہمدردی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔

بختیار کی شخصیت میں دوسروں کی مدد کرنا جیسی تذکیری خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں۔ وہ اپنے باپ کے انتقال کے بعد اعظم بیگ کی مدد کرنے سے بھی پیچھے نہیں ہٹتا۔ وہ جانتا ہے کہ اعظم بیگ کو اس کے والد ماہانہ چندر قم دیا کرتے تھے اس نے بھی اس چیز کو برقرار رکھا اور اعظم بیگ کی مدد کر کے انھیں مایوس نہ کیا۔ مگر اعظم بیگ کو رقم دینا اس کے لیے ایک پیچیدہ مرحلہ تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ یہ رقم ان کے ہاتھ میں کس طرح دے کہ نہ تو انھیں شرمندگی ہو اور نہ اسے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے۔ اس لیے بختیار سوچتا ہے کہ "ایک شریف آدمی کے لیے ایک شریف آدمی کی مدد کرنا بھی ایک مرحلہ ہوتا ہے"۔[۳۰] بختیار نے لفافے میں پیسے ڈال کر شرم سار نظروں سے ان کو دیے مگر وہ بختیار کی مدد سے مطمئن ہو گئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بختیار میں ہمدردی اور مدد کرنے کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے مطابق دوسروں کی مدد کرنا تذکیری خصائص میں شامل ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو بختیار کی بختیار کی شخصیت ہر لحاظ سے بہتر ہے اس نے بیرونی معاملات کے ساتھ ساتھ گھر کے معاملات کی طرف بھی توجہ دی، اس میں ہمدردی، صبر اور دوسروں کی مدد کرنا جیسے تذکیری خصائص بھی موجود ہیں۔ اس لیے یہ ایک تذکیری کردار ہے۔

مسعود:

مسعود جہانگیر مرزا کی رشتہ دار ہاشمی آپا کا بیٹا ہے۔ یہ بچپن میں ہی یتیم ہو جاتا ہے۔ مگر ہاشمی آپا اس کی تربیت اس انداز سے کرتی ہیں کہ اس میں خودداری پیدا ہو جاتی ہے۔ مسعود کو اپنی غربت پر شرمندگی نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے حالات سے ہر حال میں مطمئن رہتا ہے۔ صولت کی شادی کے موقع پر جب شہریار مسعود کو جوتے پہنوانے کے لیے لے کر جاتا ہے تو وہ انکار کر دیتا ہے۔ مگر جب شہریار اسے کہتا ہے کہ یہ پیسے اس کی ماں نے دیے ہیں تو وہ جوتے پہننے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسعود کے کردار میں چھوٹی عمر سے ہی عزت نفس اور خودداری جیسی صفات پائی جاتی ہیں۔

صولت آرا کی شادی پر مسعود اور گیتی آرا کی دوستی ہوتی ہے۔ مسعود گیتی کی دولت مندی سے بالکل مرعوب نہیں ہوتا۔ رفتہ رفتہ دونوں کی دوستی محبت میں بدل جاتی ہے۔ مسعود اپنی محبت کا اظہار نہیں کرتا کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اس کے اور گیتی کے درمیان طبقات کی اونچی دیوار حائل ہے۔ وہ اس حقیقت سے آشنا ہے کہ دولت مند طبقہ غریب طبقے سے رشتہ داری کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ اس لیے وہ اپنے جذبات کو گیتی پر عیاں نہیں ہونے دیتا۔ جذبات پر قابو پانا تذکیری خصائص میں شامل ہے۔ ایسا کہنا کہ مرد اپنے جذبات و احساسات کو سمجھ نہیں سکتے یا ان پر عمل نہیں کرتے تو یہ غلط ہے۔ مردوں کو ہمیشہ سکھایا جاتا ہے کہ اپنے جذبات کو کسی کے سامنے ظاہر نہ کریں اسی کو جدید اصطلاح میں تذکیریت کا حامل ہونا کہتے ہیں۔ مردوں کو اپنے جذبات چھپا کر رکھنے چاہئیں اور اگر وہ ایسا کرنے سے قاصر ہیں تو یہ ان کے لیے خامی تصور کی جاتی ہے۔ وہ شخص حقیقی کردار کا مالک ہے جو اپنے احساسات کو چھپا لے۔ مسعود کا کردار بھی ایسا ہی ہے اس نے گیتی سے اپنی محبت کا اظہار نہ کیا۔ مگر گیتی اس نظریے یا معاشرتی رویے کی قائل نہیں ہے کہ انسان جس سے محبت کرتا ہے اسے نہ بتائے بلکہ اپنے جذبات کو چھپا کر اندر ہی اندر مرتا رہے۔ اسی لیے گیتی مسعود سے محبت کا اظہار کر دیتی ہے۔ جیسا کہ ہمارا معاشرتی رویہ ہے کہ عورت اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتی ایسا ہی گیتی نے بھی کیا۔ مسعود گیتی کو اس کے اظہار محبت پر ڈانٹ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہاری عمر اس قسم کی باتیں کرنے کی نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسعود میں اپنے جذبات پر قابو رکھنا جیسی تذکیری خصوصیت پائی جاتی ہے۔

وہ خوددار اور حقیقت پسند انسان ہے۔ گیتی کو اس کی محبت کا جواب نہ دینے کا سبب یہ ہے کہ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے کہ گیتی کی اماں مخمل میں ٹاٹ کے پیوند کو پسند نہیں کرتیں۔ اس حوالے سے اس کی سوچ یہ ہے:

میرے اور تمہارے درمیان تنگ دستی اور فراغت کی ناقابل عبور دیواریں حائل ہیں۔۔۔ میری اور تمہاری دنیا میں بڑا فرق ہے۔۔۔ یہ بھی ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ تم نے اپنے طبقے سے الگ ہو کر یہ بات سوچی ہی کیسے۔ تمہارے طبقے اور حیثیت کی لڑکیاں تو ہم جیسوں کو انسان ہی نہیں سمجھتی ہیں۔ میرے جیسے کسی انسان کی پر شوق نظر یا توجہ کے تصور ہی سے انھیں پھریریاں آتی ہیں۔ کاش میں تمہارے طبقے کی لڑکیوں اور لوگوں کی باتیں نہ سن رکھی ہوتیں جو وہ نفرت اور حقارت کے عالم میں میرے طبقے کے متعلق کرتے ہیں تو میں بھی بڑے چاؤ سے عرض نیاز کرتا۔[۳۱]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسعود نے اس طبقاتی فرق کی بنا پر اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا کیوں کہ وہ اس حقیقت سے آشنا ہے کہ یہ فرق ختم کرنا ممکن نہیں۔ وہ اس حقیقت سے بھی واقف ہے کہ اس کا طبقہ اپنی جھوٹی آن اور فریب خوردگی کو عزت نفس کا نام دیتا ہے۔ وہ اپنے اور گیتی کے معاملے کو قسمت پر چھوڑ دیتا ہے۔ مگر گیتی کی محبت نے اسے بے چین کر دیا۔ آخر کار اس کی محبت کا انجام وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ صولت آرا نے ہاشمی آپا سے اس حوالے سے تلخ کلامی کی اور ان کی عزت نفس کی دھجیاں بکھیر دیں۔ جس پر ہاشمی آپا نے مسعود سے کہا کہ:

مجھے تمہاری ذات سے ذلت کی نہیں عزت کی توقع تھی، آج تم نے مجھے بری طرح ذلیل کروایا ہے اور مسعود اگر تو غیرت دار ہے تو کبھی اس راستے پر بھی نہ چلیو جس پر ان لوگوں کا سایہ بھی نظر آئے۔[۳۲]

مسعود نے اس تمام معاملے پر صبر سے کام لیا۔ اس کے رویے میں مثبت تبدیلی آئی۔ وہ محنت و لگن سے پڑھنے لگا۔ وہ صبح کالج میں پڑھتا، شام کو ٹیوشن پڑھاتا اور پھر رات کو دیر تک وہ اپنے غیر آرام دہ کمرے میں بیٹھ کر کتابوں سے سر مارتا۔ مگر اس نے محنت سے منھ نہ موڑا اور ان تھک محنت کر کے ایک دن انجینئر بن گیا۔ اسے اپنی غربت پر کبھی بھی شرمندگی نہیں ہوئی۔ وہ پر اعتماد ہونے کے ساتھ محنتی بھی ہے۔ اسی لیے محنت کر کے انجینئر بنا اب اس کی حیثیت گیتی کے خاندان کی حیثیت سے کسی بھی طرح کم نہ رہی۔ یہاں مسعود کے کردار کی ایک یہ خصوصیت سامنے آتی ہے کہ گیتی اور اس کے تعلق ختم ہونے کے بعد بھی اس نے شہریار کی طرح ہمت نہ ہاری بلکہ صبر سے کام لیا اور نہایت حوصلے کے ساتھ زندگی میں آگے بڑھا اور بہترین مقام حاصل کیا۔

مسعود کے کردار کا ایک مثبت پہلو یہ بھی ہے کہ اس کی منگنی کامنی کے ساتھ اگرچہ زبردستی کی گئی۔ وہ اس منگنی سے ناخوش ہے مگر اس کے باوجود اس نے کامنی کو خوش رکھا۔ جیسا کہ انسان اپنی ناکامی پر رد عمل کے طور پر تشدد کا رویہ اختیار کرتا ہے اس نے ایسا نہ کیا بلکہ وہ ایک ایسے انسان کی صورت میں دکھائی دیتا ہے جو کسی کو بلا وجہ اس کے ناکردہ گناہوں کی سزا نہیں دیتا۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مسعود کا کردار جاندار ہے اس میں جذبات پر قابو پانا، محنت، صبر اور جرأت جیسے تذکیری خصائص پائے جاتے ہیں۔

مالی (مرلی):

مرلی ایک ہندو کردار ہے۔ یہ جہانگیر مرزا کے گھر مالی کی ملازمت کرتا ہے۔ مرلی کو اپنے مالکوں سے بہت محبت ہے۔ اس میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ اس کی خوشیاں اس کے مالکوں سے وابستہ ہیں۔ اس لیے جب پاکستان وجود میں آیا تو وہ بہت خوش ہوا اور اس نے بیگم صاحبہ کو پاکستان بننے پر مبارک باد بھی دی۔ مالی وفادار نمک خوار ملازم ہے۔ قیام پاکستان کے وقت پیش آنے والے حالات میں جب اس گھر کا ملازم شریف مارا گیا تو اماں بیگم اور شریف کی بیوی مالی سے خوف زدہ ہو گئیں کیوں کہ وہ ہندو تھا۔ اس وقت ہندو اور مسلمانوں کے مابین جھگڑے چل رہے تھے اور دونوں قوموں کے مابین قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ مگر مالی میں ہمدردی اور انسان دوستی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ جب مالی گھر میں داخل ہوتا ہے اور اماں بیگم کے منھ سے اپنے متعلق یہ الفاظ سنتا ہے کہ یا اللہ! تو عزت و آبرو کی خیر رکھنا تو اسے بہت دکھ ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

> بٹیا مجھ سے ڈر گئی، اور جب شریف نہ ہوتا تو بیگم صاب بیٹیوں کے ساتھ مجھے گاڑی میں بٹھا کر اسکول بھیجا کرتی تھیں۔ اس کا دل چاہا، گیتی سے کہے بٹیا! مجھ سے کیوں ڈر گئی؟ میں تو باغ کا مالی ہوں۔ میں نے تو پودوں کو سینچنا اور پروان چڑھانا سیکھا ہے۔ اور اب میں کس منھ سے کہوں کہ مالی کے دم میں دم ہے تو آپ کو کوئی ڈر نہیں۔ [۳۳]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مالی ہندو ہونے کے باوجود اپنے مسلمان مالکوں سے محبت کے جذبات رکھتا ہے۔ مالی اپنے مالکن کے خدشوں کے باوجود ان کا تحفظ کرتا ہے۔ وہ ان کی حفاظت کی خاطر اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر رات بھر جاگ کر گھر کے باہر پہرہ دیتا ہے تاکہ اس گھر کی خواتین کی عزت پر کوئی آنچ نہ آئے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ برسوں ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کی وجہ سے لوگ قومیتوں اور مذہبوں کے فرق کو بھول جاتے ہیں۔ ان میں محبت کا رشتہ پروان چڑھتا ہے۔ یہ صورت حال یہاں بھی پیش آئی۔ مالی اماں بیگم اور گیتی کو پاکستان پہنچانے کے لیے بہت مشکل سے انتظام کرتا ہے۔ کپور صاحب کے سامنے روتا ہے ان کے پاؤں پڑتا ہے تب جا کر کہیں جیپ کا انتظام ہوتا ہے۔ مالی گیتی اور اماں بیگم کو فوجی سپاہیوں کی حفاظت میں جیپ میں بٹھاتا ہے او یہ دیکھ کر خوشی محسوس کرتا ہے کہ اس نے اپنی ذمہ داری کو پورا کیا۔ اسی خوشی میں وہ یہ بھول جاتا ہے کہ یہ لوگ اب کبھی بھی واپس نہیں آئیں گے۔ جیپ جانے کے بعد مالی کو خیال آتا ہے کہ میں نے آخری بار اپنی بیگم صاحبہ کو سلام بھی نہیں کیا۔ ان تمام واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرلی ایک وفادار ملازم ہے اس نے تمام عمر جہانگیر مرزا کے گھر گزاری اور

اس کے بچوں کی پرورش بھی اسی گھر میں ہوئی۔ اس نے نہایت ایمان داری سے اپنا کام کیا اور باغ کی دیکھ بھال کی۔ سید جاوید اختر مالی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> الطاف فاطمہ نے اپنے ناول "دستک نہ دو" میں ایسا ہی ایک یار گار ہندو کردار پیش کیا ہے جو ایک بڑے مسلمان گھرانے میں مالی کے طور پر کام کرتا تھا۔ اس گھر کا ایک اور ملازم شریف بن سنور کر جمعہ پڑھنے جاتا ہے تو بیگم صاحب اس کا سبب پوچھتی ہیں۔ وہ جواباً بتاتا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد پہلا "جما" پڑا ہے جو عید سے بھی بڑا ہے۔ یہ شریف مسجد میں بلوائیوں کے حملے سے شہید ہو گیا اور گھر کی عورتیں اس ہندو مالی سے بھی ڈرنے لگیں۔ مگر مالی چونکہ ان کا پرانا نمک خوار تھا اور اس کی رگوں میں انسان دوستی کا لہو ابھی گرم تھا۔ اس صورت حال سے بڑا بد دل ہوا۔[۳۴]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرلی مالی میں انسان دوستی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ اسی لیے وہ گیتی اور اماں بیگم کی مدد کرتا ہے۔ رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے تناظر میں مالی میں مدد کرنے اور انسان دوستی جیسی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ قیام پاکستان کے موقع پر ہندو مسلم ایک دوسرے کی جان کے درپہ تھے۔ لڑکیوں کی عزتوں کو لوٹا جارہا تھا بچوں کو قتل کیا جارہا تھا۔ مذہب کی بنیاد پر قتل وغارت گری کا بازار گرم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اماں بیگم اور گیتی مالی کے گھر میں داخل ہوتے ہی خوف زدہ ہو گئیں۔ مگر مالی نمک خوار اور وفادار شخص ہے۔ اس نے ان لوگوں کی حفاظت کی اور پاکستان بھیجنے میں مدد کی۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسانوں کو مل جل کر رہنے سے جو الفت و محبت ہو جاتی ہے اس میں مذہب کی دیواریں حائل نہیں ہوتیں مزید براں ہر مذہب میں اعلیٰ صفات اور نیک انسانی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

جہانگیر مرزا:

جہانگیر مرزا اس ناول کا مرد کردار ہیں۔ ناول کی کہانی ان کے گھرانے کے گرد گھومتی ہے۔ اس کے خاندان کا شمار سماج کے معززین اور امرا میں ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے ان کا طرز زندگی مختلف ہے۔ جہانگیر مرزا نیک سیرت اور منکسر المزاج شخص ہیں۔ ان کی شخصیت پر کشش اور جاذبیت کی حامل ہے۔ یہ اپنے سے متعلق لوگوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اپنی والدہ، بیوہ بھابھی اور بھتیجیوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ان سب سے ہمدردی اور شفقت سے پیش آتے ہیں۔ رابرٹ ووڈ نے تذکیری خصوصیات کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ یہ دوسرے کرداروں یعنی بچوں، عورتوں اور مردوں کی مدد کرتے ہیں اور درست رہنمائی کرتے ہیں۔ جہانگیر مرزا کے کردار میں بھی یہ تذکیری خصوصیت موجود ہے۔ وہ اپنے ملازمین اور رشتہ داروں سے نہایت نرمی سے پیش آتے ہیں اور ہر ایک کی ضروریات کا خیال رکھتے ہیں۔ وہ عزیز و اقارب کی اس طرح مدد کرتے ہیں کہ کسی کو اس کی خبر نہ ہوتی۔ لینے والا شخص

بھی شرمندہ نہ ہوتا۔ وہ اپنے گھر آنے والے ہر شخص کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے مگر بیگ صاحب کو تو بالخصوص توجہ دیتے تھے تاکہ انھیں اپنی حیثیت کی کمی محسوس نہ ہو:

> اور جب اصرار کے باجود بیگ صاحب کھانے کے لیے نہ رکے تو وہ اٹھے دراز میں سے ایک بند لفافہ نکالا اور بیگ صاحب کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس میں دس دس کے چار نوٹ تھے۔ آج مہینے کی پانچ تاریخ تھی نا۔ ہر مہینے کی پانچ تاریخ کو ایسا ہی ایک بند لفافہ ان کے ہاتھ سے سرک کر چپکے سے بیگ صاحب کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے۔ یہ کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی۔[۳۵]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہانگیر مرزا میں مدد کرنے کے جذبات موجود ہیں۔ وہ چپکے سے لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ ان میں اتنی دولت کے باوجود بھی غرور و تکبر نہ پایا جاتا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انھیں دین سے بہت لگاؤ ہے اور انھیں دینی تعلیمات کی بدولت ہی ان کے اندر دوسروں کی مدد کرنا اور ہمدردی و رحم جیسی صفات پیدا ہوئیں۔ ان کے برعکس ان کی بیوی شاہ بانو بیگم میں اپنی حیثیت کی وجہ سے غرور پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے غریب رشتہ داروں سے ملنا اور ان سے تعلق رکھنے کو پسند نہیں کرتیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی اولاد کے لیے غلط فیصلے کیے۔

جہانگیر مرزا جانتے ہیں کہ اس گھر میں گیتی کے ساتھ ناانصافی ہوتی ہے اسی لیے وہ اس کی طرف توجہ دیتے ہیں اور اس کو احساس دلاتے ہیں کہ وہ ان کی تمام اولاد میں سے انھیں سب سے پیاری ہے۔ اس حوالے سے سید جاوید اختر لکھتے ہیں:

> گھر میں جو واحد ہستی گیتی کو اچھی لگتی تھی وہ ابا میاں کی تھی۔ اور وہ بھی اپنی اس فراموش کردہ بیٹی کو بہت چاہتے تھے۔ اماں بیگم سے ڈر۔ ان دونوں باپ بیٹی کی قدر مشترک تھا۔ جب بھی موقع ملتا وہ ایک دوسرے کی دلجوئی کرتے۔ باپ کو معلوم تھا کہ گیتی کا دل بڑا فراخ اور حساس ہے اور وہ دوسروں کے لیے نیک تمنائیں رکھتی ہے۔ گویا وہ اس کے باطنی حسن کو پہچانتے تھے، جس میں سکون اور طمانیت جھلکتی تھی۔ باپ کی محبت نے اسے ٹوٹنے اور بکھرنے سے بچالیا۔[۳۶]

الطاف فاطمہ نے جہانگیر مرزا کے کردار کو ناول میں اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ گھر کے تمام اندورنی معاملات اور بچوں کے حوالے سے بری الذمہ ہیں۔ انھوں نے گھر اور بچوں کی تمام ذمہ داری اپنی بیوی کے سپرد کر دی اور خود کو بیرونی معاملات تک محدود رکھا۔ دراصل یہ ہمارا مشرقی سماجی تذکیری رویہ ہے جس کی رو سے گھر اور بچوں کا سنبھالنا بیوی کے ذمے ہے جب کہ مرد کے حوالے سے تذکیری رویہ یہ ہے کہ وہ بچوں اور گھر کی فکر سے آزاد ہے۔ اس کی تمام تر ذمہ داریاں خارجی امور تک محدود ہیں۔ جہانگیر مرزا کے کردار کے حوالے سے یہ ان کے کردار کا منفی پہلو سمجھا جاتا ہے۔ کیوں کہ انھوں نے گھر کی تمام ذمہ داریاں بیگم شاہ بانو کو دیں اور بیگم شاہ بانو نے اپنی اعلیٰ نسبی

پر فخر کرتے ہوئے اپنے غریب رشتہ داروں سے قطع تعلقی کی اور اپنی اولاد کے جذبات کو اپنی جھوٹی انا کی تسکین کی خاطر روند ڈالا جس کا خمیازہ بعد میں انھیں اور رجہانگیر مرزا کو بھگتنا پڑا۔ اولاد کے غم نے جہانگیر مرزا کو کھوکھلا کر دیا۔ وہ اس حوالے سے سوچنے لگے کہ انھیں یہ عزت، شہرت اور رتبہ بے شک نصیب نہ ہوتا مگر اولاد کا سکھ نصیب ہوتا:

> ہر طرف سکون تھا اور خاموشی ماسوا ان کے غمزدہ دل کے۔ ان کے بچے منتشر اور پراگندہ تھے۔ وہ ان میں سے کسی کی طرف سے مطمئن اور مسرور نہ تھے۔ اے کاش! یہ سب کچھ میسر نہ ہوتا مگر میرے بچوں اور ان کی ماں کے درمیان مفاہمت ہوتی۔ اے کاش! میں ان کے لیے اجنبی کا درجہ نہ رکھتا۔ کتنی سچی بات کہی ہے بیگ نے گھٹلی کی خرابی کا یہ مطلب سمجھیے کہ جڑ میں روگ ہے اور اس کی خرابی کی بہت سی وجوہ ہو سکتی ہیں۔[۳۷]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہانگیر مرزا کی عدم توجہی کے سبب ان کی اولاد منتشر ہو گئی۔ رابرٹ ووڈ کے مطابق مثالی آدمی ہر لحاظ سے بہتر ہوتا ہے۔ زندگی کے تمام پہلوؤں پر اس کی نظر ہوتی ہے۔ جہانگیر مرزا کے کردار میں یہ خصوصیت نہیں پائی جاتی۔ مگر یہ کردار مکمل طور پر غیر تذکیری کردار نہیں ہے بلکہ اس میں مدد کرنا ،درست رہنمائی کرنا جیسے تذکیری خصائص موجود ہیں جو ان کی وجیہہ شخصیت کو متاثر کُن بناتے ہیں۔

شہریار:

شہریار جہانگیر مرزا کا سب سے بڑا بیٹا ہے۔ وہ خوش اخلاق اور صلح جو شخص ہے۔ ناول میں شہریار کا تعارف اس کی بہن صولت آرا کی شادی پر کروایا گیا۔ شہریار کسی دوسرے شہر میں تعلیم حاصل کرتا ہے اور وہ یہاں اپنی بہن کی شادی پر آتا ہے اور سب کے ساتھ گھل مل جاتا ہے۔ وہ شادی پر بہت رونق لگاتا ہے اور اپنی چچازاد بہنوں سے مذاق کرتا ہے۔ جب صولت آرا "میری قسمت میں بڈھا لکھاری" گیت سنتی ہے تو اس کا دل بھر آتا ہے اور اس کے آنسو شہریار کے ہاتھ پر گرتے ہیں تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بہن اس شادی سے خوش نہیں ہے وہ اس بات پر بہت دکھی ہوتا ہے مگر وہ اپنی بہن کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ شادی کے موقع پر شہریار مسعود کو جوتے پہنانے کے لیے صفدر یاسین کی دکان پر جاتا ہے اور وہاں صفدر کی مصوری کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے۔ وہ آرٹ پسند شخص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں احساس بھی بہت زیادہ ہے۔

شہریار اپنے چچا کی بیٹی عصمت سے محبت کرتا ہے۔ مگر اس کی ماں اس رشتے کو پسند نہیں کرتی۔ اماں بیگم کے مطابق اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان کی حیثیت اور رتبے کے مطابق نہیں ہے۔ شہریار کی کوششوں کے باوجود بھی جب اماں بیگم عصمت کے رشتے کے لیے نہیں مانتیں تو وہ دل برداشتہ ہو کر ولایت چلا جاتا ہے۔ جہاں وہ فوج میں بھرتی ہو کر جنگ عظیم دوم میں اپنی جان دے دیتا ہے۔ شہریار ان حالات کا مقابلہ بہادری سے نہیں کرتا۔ وہ افسردہ دل کے

ساتھ فرار کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ جب کہ تذکیری تھیوری کے مطابق دیکھا جائے تو مثالی آدمی وہ ہوتا ہے جو ہر لحاظ سے بہتر ہو، مشکل حالات کا مقابلہ دلیری و جواں مردی سے کرے۔ وہ اپنے نظریے پر قائم رہتے ہوئے بہادری کا مظاہرہ کرے۔ مگر شہریار حالات سے فرار کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ شہریار کے کردار میں تذکیری خصائص نہیں ہیں۔ اس کا اندازہ بختیار کی سوچ سے لگایا جاسکتا ہے جب والد کی وفات کے بعد اسے اپنے بھائی کی ضرورت ہوتی ہے:

> بڑے بھیا! یہ بھی کوئی کیریکٹر ہوا کہ حالات اور الجھنوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے انسان میدان چھوڑ کر بھاگ جائے۔ مجھے سب معلوم ہے کہ تم نے کیوں گریز و فرار کی راہ اختیار کی۔ بات یہ ہے نا کہ شروع سے تو تمہاری ہر بات مانی گئی۔ ہر ضد پوری کی گئی۔ مخالفت اور الجھن کے نام سے تم کو واقف ہونے ہی نہیں دیا گیا اور جو اچانک تمہاری ماں تمہارے مقابلے پر آگئی تو تم بھاگ لیے۔ اور اپنے حسابوں تم ان کو سزا دے رہے ہو۔ لیکن سزا تو تم نے اپنے آپ کو دی ہے اور اپنے باپ کو دی اور اب میں اس کو بھگت رہا ہوں۔[۳۸]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہریار کا کردار حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ وہ ہمت و حوصلہ ہار بیٹھتا ہے اور اپنے تئیں اسی فرار کے راستے کو بہتر سمجھتا ہے۔ یہ ایک غیر تذکیری رویہ ہے۔ اس نے ولایت جا کر اپنے باپ کو بھی غمگین کیا اور اپنے چھوٹے بھائی کو تنہا چھو دیا۔ شہریار کا کردار ناول میں مختصر عرصے کے لیے نمودار ہوا اور صولت کی شادی پر ہی نظر آتا ہے بعد ازاں اس کا ذکر ناول کے دیگر کرداروں کے ذریعے کیا جاتا رہا ہے۔

کرنل سجاد:

کرنل سجاد صولت آرا کے شوہر کا رشتہ دار ہے۔ یہ خوب رو اور پر کشش شخصیت کا مالک ہے۔ یہ فوجی افسر انٹیلی جنس سے تعلق رکھتا ہے۔ اور نہایت ذہین اور دور اندیش ہے۔ اس کی بیوی رضیہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ یہ اپنے رشتے کی بھابھی صولت آرا کے حسن کی وجہ سے اس کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ سجاد کی خاندانی وجاہت، عہدے اور پر کشش شخصیت کی وجہ سے غیر شادی شدہ لڑکیوں کے علاوہ شادی شدہ عورتیں بھی اس کی طرف مائل ہوتی ہیں مگر کوئی بھی عورت اس کی دل کی گہرائیوں میں اتر نہیں پاتی۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ صولت آرا سے محبت کرتا ہے اور وہ ہمیشہ اس کا انتظار کرتا رہے گا۔ مگر جلد ہی اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ صولت ایک کھوکھلی عورت ہے۔ اس کی ملاقات جب گیتی سے ہوتی ہے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ گیتی اپنی دوسری بہنوں سے بہت مختلف ہے۔ اس کی شخصیت میں بے باکی ہے وہ جو سوچتی ہے وہ کہہ دیتی ہے۔ اسے گیتی کی شخصیت اپنی شخصیت سے ہم آہنگ محسوس ہوئی۔ وہ گیتی کی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے مگر اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرتا۔ وہ اس حوالے سے بہت بے چین رہتا ہے۔ اگرچہ وہ اس بات کا قائل ہے کہ جو بات ذہن میں ہو اسے زبان سے ادا کر دینا چاہیے مگر یہ ایک تذکیری رویہ

ہے کہ مرد اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرتا۔ جوڈتھ بٹلر کے مطابق مرد عورت کی نسبت اپنے جذبات کا اظہار کم کرتا ہے۔ اسے اپنے جذبات پر قابو پانا آتا ہے۔ مرد کا اظہاری رویہ معتدل طور پر سامنے آتا ہے۔ یہ بھی اسے معاشرہ سکھاتا ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو کرنل سجاد اس تذکیری رویے کو اپناتے ہوئے اپنی محبت کے اس جذبے کو اپنے دل میں چھپالیتا ہے۔

پاکستان بننے کے بعد کرنل سجاد پاکستان آجاتا ہے۔ اچانک ایک مدت کے بعد اس کی ملاقات کسٹوڈین کے دفتر میں گیتی سے ہوئی۔ جس کی وجہ سے سجاد کا گیتی کے گھر آنا جانا شروع ہو گیا۔ گیتی جب مری میں مسعود اور کامنی کو دیکھتی ہے تو بہت افسردہ ہوتی ہے۔ سجاد اس حقیقت کو جان لیتا ہے کہ وہ کیوں افسردہ ہے اور وہ گیتی کو اس احساس سے نکالنے کے لیے اسے باتوں ہی باتوں میں سمجھاتا ہے اور مشورہ دیتا ہے:

دیکھو، لڑکی! اب جو حاضر ہے، اسی کو غنیمت جانو اور دل لگاؤ۔

میں کہتا ہوں کہ جب تمہارا ماضی تمہارا ساتھ نہ دے سکے تو اس پر خاک ڈالو۔[۳۹]

رابرٹ ووڈ کے مطابق مثالی آدمی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ دیگر کرداروں مردوں، عورتوں اور بچوں کی مدد کرے اور لوگوں کی درست رہنمائی کر سکے۔ اس اقتباس کی روشنی میں دیکھا جائے تو کرنل سجاد کے کردار میں بھی درست رہنمائی کرنا اور مدد کرنا جیسی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ وہ گیتی کو ہر طرح کی نفسیاتی الجھن سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے طور پر اس حوالے سے اس کی مدد کرتا ہے۔ گیتی کی منفرد شخصیت اور اس کی حماقتیں اسے پسند آتی ہیں اور وہ اس سے اظہار محبت کرتا ہے۔ وہ گیتی کو اس احساس کمتری سے نکالتا ہے کہ وہ غیر اہم ہے۔ بلکہ وہ اسے باور کروانے کی کوشش کرتا ہے کہ اپنی منفرد شخصیت کی وجہ سے وہ بہت اہم ہے۔ رابرٹ ووڈ اپنی تھیوری میں بیان کرتے ہیں کہ ایسا کہنا کے مرد کے اندر احساسات و جذبات نہیں ہوتے ایک لطیفہ معلوم ہوتا ہے۔ زیادہ دلچسپ اور مضبوط کردار کا حامل وہ شخص ہے جو مضبوط اعصاب کا مالک ہو۔ اپنے احساسات و جذبات کو چھپالے۔ مگر اس کردار پر بھی غور کرنا چاہیے جو ان جذبات کو دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر ناکام ہو جاتا ہے یا پھر وہ کردار جس نے اپنے جذبات کو اتنے لمبے عرصے تک دبائے رکھا ہو کہ انھیں سامنے لانے میں دشواری ہو۔ کرنل سجاد کا کردار بھی ایسا ہی ہے جس نے اپنے جذبات کو اتنے طویل عرصے تک چھپائے رکھا۔ مگر اس کی محبت کے اظہار کے ذریعے گیتی اپنی نفسیاتی الجھنوں سے نکل آئی۔ کرنل سجاد کے حوالے سے کنور نسیم لکھتے ہیں: "کرنل سجاد کا کردار اس لحاظ سے اہم ہے کہ وہ ہیروئن کو نفسیاتی دباؤ سے "دستک دے کر" نکال لاتا ہے۔"[۴۰]

زبیر:

زبیر کا ذکر ناول میں اختصار کے ساتھ آیا ہے۔ زبیر خوش شکل، جاذب نظر نوجوان صحافی ہے۔ وہ اپنی غربت کی وجہ سے بہترین لباس پہننے کی وسعت نہیں رکھتا اور وہ اپنی سفید پوشی کو قائم رکھنے کے لیے سفید پاجامے کے ساتھ کھادی کا کرتا پہنتا ہے۔ وہ باطنی طور پر اس قدر مکمل ہے کہ ظاہری زندگی کے خوف ناک خلا بھی اس کو بے تاب نہیں کرتے۔ وہ رب کی رضا میں خوش رہنے والا شخص ہے۔ صولت اور زبیر ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں ان کے درمیان مفلسی کی دیوار حائل ہے۔ جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اماں بیگم متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے لڑکوں کے متعلق اچھے خیالات نہیں رکھتیں اور وہ صولت کی شادی زبیر سے کرنے کے لیے رضامند نہیں ہیں تو وہ صبر سے کام لیتا ہے اور بے نیازی سے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ زبیر میں محبت سے زیادہ خودداری کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ وہ صولت آرا کی شادی کے بعد سخت محنت کرتا ہے تاکہ اپنی زندگی میں ترقی کر کے کوئی مقام حاصل کر سکے۔ وہ اپنی محنت و لگن کے سبب پبلک ریلیشن آفیسر کے عہدے پر فائز ہوتا ہے اور عصمت سے شادی کر کے خوش گوار زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ شہریار کی طرح فرار کا راستہ اختیار نہیں کرتا بلکہ صبر و محنت سے کام لیتا ہے۔ یہی اس کی تذکیری خصوصیت ہے۔

چلتا مسافر:

چلتا مسافر کی کہانی سید صاحب کے گھرانے کے گرد گھومتی ہے۔ یہ گھرانہ قیام پاکستان کے لیے کوشاں ہے۔ اس مقصد کے لیے اس گھرانے نے بہت سی قربانیاں دیں جن میں جانی اور مالی قربانیاں شامل ہیں۔ بہت تکالیف برداشت کیں۔ مگر اس کا ثمر انھیں نہ ملا باوجود اس کے وہ اپنے مقصد سے کبھی عاری نہیں ہوئے۔ یہ گھرانہ مسلمانوں کے درمیان کسی بھی تفریق کو نہیں مانتا چاہے وہ تفریق لسانی، صوبائی یا علاقائی ہو۔

مزمل:

مزمل ناول کا اہم مردانہ کردار ہے۔ یہ کردار علی گڑھ سے تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ کا سرگرم کارکن بھی رہا۔ اس نے قیام پاکستان کے لیے سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ قیام پاکستان سے قبل بقرہ عید کے موقع پر ہمیشہ جھگڑا ہوتا جس میں اکثر لوگ مارے جاتے۔ اس طرح کے فسادات میں مزمل نے لوگوں کی مدد کی۔ یہ حساس اور نرم دل کا مالک ہے۔ اس نے فسادات میں جب ایک مرنے والے کا جنازہ اٹھایا تو اس کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں: "مزمل کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گرنے لگے تھے۔ جنازے کے ایک ہمراہی نے دوسرے کو کہنی مار کر اس کی طرف متوجہ کیا تھا، "سید صاحب کا بیٹا بڑے نرم دل کا ہے۔"[۴۱] مزمل کو اس وقت ایک ایسے ہی دلخراش واقعہ کی یاد آئی جب بقر عید کے موقع پر فسادات میں نصیبا کا شوہر نصیر و بھی شہید ہوا۔ مزمل کے دل میں نصیبا کے

لیے ہمدردی کا گوشہ ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ اس کے لیے کچھ ایسا کرے کہ اس کی بے رنگ زندگی رنگوں سے بھر جائے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر وہ اماں بیگم کی جگہ ہوتا تو اپنی اولاد کی طرح اسے پڑھاتا لکھاتا۔ وہ ایک حقیقت پسند انسان ہونے کے باعث نصیبا کے ساتھ کی جانے والی ناانصافیوں کا اعتراف اس طرح کرتا ہے: "یہی کہ ہم لوگ جو اپنے آپ کو خاندانی اور بڑے لوگ کہتے ہیں، کتنے لوگوں کا خون کرتے ہیں اور ہمارے دامن پھر بھی داغ دار نہیں ہوتے۔"[۴۲]

اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ تمام انسانوں کی سوچ مختلف ہوتی ہے کسی میں مثبت اور کسی منفی سوچ پائی جاتی ہے۔ یہ سوچ ہی ہے جس کے ذریعے انسان کے جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔ منفی سوچ انسان میں حسد، غصہ اور نفرت جیسے جذبات کو جنم دیتی ہے جب کہ مثبت سوچ انسان میں ہمت و حوصلہ اور صبر جیسے جذبات پروان چڑھاتی ہے۔ مزمل میں بھی مثبت سوچ پائی جاتی ہے۔ وہ حقیقت پسند مرد ہے۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ ہمارے جیسے بڑے گھرانوں کے لوگ کسی کے ساتھ ظلم و ناانصافی کے مرتکب ہو بھی جائیں تو اس کے باوجود بھی اپنے آپ کو قصوروار نہیں سمجھتے۔ اس لحاظ سے مزمل میں یہ ایک مثبت تذکیری خصوصیت پائی جاتی ہے کہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے۔ رابرٹ ووڈ اپنی تھیوری میں مثالی آدمی کے ضمن میں مردانہ سوچ کے متعلق کہتا ہے کہ ایسے آدمی کی سوچ حقیقت پسندانہ ہوتی ہے۔ یہ سوچ اس کے کردار اور اس کے رویوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں مزمل کی بیوہ خالہ اور ان کا بیٹا نعیم مزمل کے گھر میں ہی رہتے ہیں۔ مزمل ان سے ہمدردی بھی کرتا ہے اور نعیم کی پڑھائی میں مدد کے ساتھ ساتھ اس کی درست رہنمائی بھی کرتا ہے۔ اس لیے اس کا حوصلہ بھی بڑھتا ہے۔ نعیم کہتا ہے کہ اگر مزمل اس گھر میں نہ ہوتا تو وہ ہمت و حوصلہ ہار بیٹھتا۔ دوسروں کا حوصلہ بڑھانا اور ان کی درست رہنمائی کرنا یہ مثبت تذکیری رویہ ہے۔

مزمل کو سیاست میں دلچسپی ہے۔ مزمل اور سید صاحب نے سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس کی خاطر اپنی اولادیں بھی قربان کیں مگر وہ اپنے مقصد سے پیچھے نہ ہٹے بلکہ اس پر صبر کیا اور ان حالات کا جواں مردی اور بہادری سے مقابلہ کیا۔ قیام پاکستان کے بعد مزمل کو اپنا گھر بار چھوڑ کر کیمپ میں پناہ لینی پڑی جہاں وہ بیمار ہو گیا اور نیم بے ہوشی کی حالت میں اس کا نکاح اس کے بھائی کی بیوہ راشدہ سے کروا دیا گیا۔ ہجرت کے بعد مزمل کے حالات کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

> اپنی بے روزگاری، تیزی سے خرچ ہوتی ہوئی رقم، محکمہ بحالیات کا دیا ہوا وہ چھوٹا سا پرزہ جس کے تحت وہ گھنشیام کے اس متروکہ مکان کا تالا توڑ کر چھت تلے بیٹھا تھا اور وہ تو یہ پرزہ بھی نہ ملتا جو مسلم لیگ کے بعض کارکن اس کو پہچان نہ لیتے کہ وہ سید صاحب کا لڑکا ہے۔۔۔ اور جب تالا ٹوٹا تو سارا کنبہ چپ چاپ کھڑا کا کھڑا رہ گیا تھا۔ ایک تنگ سا مکان تھا جس کی دیواریں بے شمار برساتوں

کی لگی کائی سے سبز ہو رہی تھیں۔ جابہ جا کائی نے اگنا شروع کر دیا تھا۔ نرم نرم کاشانی مخمل سی پھولتی آرہی تھی در و بام پر۔ ماضی اور حال کے منظر اتنے ٹوٹ پھوٹ کر کرچ کرچ ہو کر اب نظروں میں آتے کہ آنکھوں میں کھٹک سی ہونے لگتی۔ [۴۳]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مزمل جس شان و شوکت کی زندگی گزار کر آیا تھا مشرقی پاکستان آکر اسے عسرت کی زندگی بسر کرنا پڑی اس پر بھی اس نے صبر کیا اور شکر گزاری کے ساتھ اپنی زندگی بسر کی، وہ ہمت و حوصلہ نہیں ہارا۔ مزمل نے اپنی آدرش پسندی کے سبب تمام تر صعوبتیں برداشت کیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ممتاز احمد کا کہنا ہے: "ناول میں مرکزی کردار کی حیثیت سے منجھلا لڑکا مزمل آدرش کی خاطر جان دینے کی استعاراتی صورت حال کا اہم نمائندہ بنتا ہے۔" [۴۴] مزمل اپنے ماضی کی یادوں میں گم رہتا ہے اور اپنے آپ کو ان یادوں کے سہارے پر سکون کر لیتا ہے کہ اب وہ اس حقیقت سے آشنا ہو چکا ہے کہ انسان کا جسم اور خون ایک مٹھی بھر خاک ہیں۔ یہ سب عارضی ہے۔ جب مشرقی پاکستان کے حالات خراب ہوئے۔ اردو اور بنگلہ کا مسئلہ ہوا اور مکتی باہنی کی تحریک چلی تو لوگ اردو بولنے والوں (بہاریوں) کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ جب کہ یہی لوگ تھے جنھوں نے قیام پاکستان کے لیے ان تھک محنت کی تھی۔ اپنی جائیدادوں اور قیمتی سرمائے اور عزیزوں کو خیر آباد کہا۔ اس سے قبل معاملہ ہندو اور مسلمانوں کا تھا مگر اب تو مسلمان ہی مسلمان کی جان کے درپے تھا۔ مسجدوں میں بھی سیاست شروع ہو گئی۔ حالات یہاں تک پہنچ گئے کہ بہاریوں کے ساتھ نماز پڑھنے کو بھی پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ اس اثناء میں بھی مزمل کے پایہ استقلال میں لغزش نہ آئی۔ وہ شجاعت اور بہادری سے ان حالات کا مقابلہ کرتا رہا۔ بذلل کو محسوس ہوا کہ حالات کے سبب مزمل کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے تو مزمل بذلل کو کہتا ہے:

تم اطمینان رکھو، میں پاگل ہونے کی اہلیت کھو چکا ہوں۔ اگر میں پاگل ہو سکتا تو اس وقت ہوتا جب، جب میں کٹے ہوئے سر الگ اور دھڑ الگ دیکھا کرتا تھا۔ میں اس وقت پاگل ہوتا جب میں نے ایک دن اپنے بھائی کے زخموں سے چور جسم کو مٹی کے سپرد کیا اور دوسرے دن اپنے باپ کا جنازہ کندھوں پر اٹھا کر چلا۔ پھر اس نے رک رک کر کہا، "میں پاگل اس وقت ہو جاتا جب میں نے تین لٹی ہوئی عورتوں کی ان کلائیوں کو ننگا دیکھا جن میں سونے کی چوڑیاں جگمگاتی تھیں۔ [۴۵]

اس اقتباس کی روشنی میں دیکھا جائے تو مزمل کے کردار میں صبر جیسی خصوصیت موجود ہے۔ مرد کے لیے ہمارا معاشرہ توقع کرتا ہے کہ وہ اپنے دکھ، درد اور غم کو لوگوں پر عیاں نہ کرے۔ مزمل نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ مزمل کا تعلق سید گھرانے سے ہے۔ اسے دنیاوی تعلیمات کے ساتھ ساتھ دینی تعلیمات سے لگاؤ بھی ہے اور ان کو بہتر طریقے سے سمجھتا بھی ہے۔ اس لیے اس کی شخصیت میں اس طرح کی صفات و خصوصیات پنہاں ہیں جو اس کو مثالی و جاندار کردار بناتی ہیں۔ مزمل جب دیکھتا ہے کہ بذلل ان حالات کی وجہ سے پریشان ہے تو وہ بذلل کو

سمجھانے کی غرض سے سوال کرتا ہے کہ تم مومن ہو جس کا وہ اقرار کرتا ہے تو اس پر وہ بذلل کو صبر کی تلقین کرتا ہے اور کہتا ہے کہ: "تو پھر یہ بات سن لو۔ مومن اپنے دکھ پر صبر کرتا ہے تو اس کے قلب پر سکینہ جاری ہوتا ہے۔ یہی قلب مومن کا دھن ہے۔"[۴۶] یہی اسلامی تعلیمات ہیں جس نے مزمل کو مضبوط کردار بنایا جو وہ تمام صعوبتوں کو صبر واستقامت کے ساتھ سہہ لیتا ہے۔

مزمل 'بذلل سے بہت محبت کرتا ہے اس نے بذلل کا خیال اپنی اولاد کی طرح رکھا۔ بذلل اور مرلی کو پڑھایا ،انگریزی و دیگر تعلیمات میں ان دونوں کی مدد کی۔ دراصل مزمل گولڈ میڈلسٹ بھی تھا اور بہترین ڈبیٹر بھی۔ اسے انگریزی، بنگالی، پنجابی اور عربی زبان پر عبور حاصل ہے۔ مزمل ذہنی قابلیت کا حامل شخص ہے۔ بذلل 'مزمل کی محبت کے سبب اس کا احسان مند ہے۔ بذلل کہتا ہے کہ:

> میں ان کے قدموں میں بیٹھ کر کہہ رہا ہوں، بدھ جی، مجھے گیان دو۔ انھوں نے مجھے کتنا کچھ دیا ،میرے مانگے بغیر۔ انھوں نے مجھے ہر وقت کچھ نہ کچھ بتایا اور پڑھایا۔ میری جھولی بھرتے ہی رہے۔ میرے اور ان کے ارد گرد تلسی کے جھنڈ کھڑے ہیں۔[۴۷]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بذلل 'مزمل کی شخصیت سے متاثر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مزمل نے ہمیشہ اس کا خیال رکھا اور ہمیشہ اس کی درست رہنمائی کی۔ یہی سبب ہے کہ بذلل میں بھی مزمل جیسی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

مزمل میں انسانی ہمدردی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ وہ ہر طرح کے تعصب سے پاک ہے۔ وہ کسی بھی قسم کی علاقائی، لسانی و صوبائی تفریق کو نہیں مانتا۔ اس کے نزدیک سب کی ایک ہی قومیت ہے وہ ان میں تفرقہ نہیں رکھتا۔ اسی لیے اس نے بذلل، مرلی اور ہاجرہ سب کی مدد کی۔ اس کی دکان پر ہندو 'مسلم سب آکر بیٹھتے جن میں بنگالی و بہاری شامل تھے۔ سب ایک دوسرے سے بھائیوں کی طرح ملتے۔ مگر مشرقی پاکستان میں ہونے والے انتشار نے سب کو الگ الگ کر دیا۔ سب ایک دوسرے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ ایک دوسرے کی جان کے در پہ ہو گئے۔ گھروں کو جلایا جانے لگا لوگوں کو سر عام قتل کیا جانے لگا۔ قبرستان پھیل کر گھروں تک آ گئے۔ یہ سمجھنا مشکل ہو گیا کہ آخر یہ سب کر کون رہا ہے۔ سب لوگ تو امن چاہتے ہیں۔ ان فسادات کا شکار زیادہ تر بہاری ہوئے۔ الطاف فاطمہ نے مزمل کے گھرانے کے ذریعے بہاریوں کے مسائل و مشکلات کو انتہائی دل سوز انداز میں پیش کیا۔ مزمل کے کردار کے متعلق ڈاکٹر نجمہ صدیق لکھتی ہیں:

> ناول کا سب سے اہم کردار مزمل ہے جسے الطاف فاطمہ نے سراپا خیر بنا کر پیش کیا ہے۔ اس کردار میں کوئی جھول نظر نہیں آتا۔ مزمل کا کردار مصیبتوں اور آزمائشوں کے درمیان زندہ رہنے اور آگے بڑھنے اور کچھ پانے کا حوصلہ دیتا ہے۔ بلاشبہ یہ کردار الطاف فاطمہ کی زبردست تخلیقی قوت

کا مظہر ہے۔ اس کردار کے ذریعے ہی مصنفہ نے اپنے ناول کے موضوع کو بیان کیا ہے اور اپنے ذاتی خیالات و نظریات کا پرچار بھی اسی مرکزی کردار کے توسط سے کیا ہے۔ یہ کردار شروع سے لے کر آخر تک قارئین کی توجہ اپنے اندر کھینچ لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔[۴۸]

مزمل ان حالات میں گھنشیام کے گھر اس طرح رہتا ہے کہ کسی کو اس کی خبر نہیں ہوتی کہ وہ اس گھر میں مقیم ہیں۔ ایسا کرنے کے لیے بذلل نے اسے مجبور کیا ورنہ وہ چوروں کی طرح اس گھر میں رہنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ مردوں کی طرح حالات کا مقابلہ کر کے جینے کا قائل ہے۔ مزمل کو ان کشیدہ حالات میں ہاجرہ کی فکر لاحق ہے۔ ہاجرہ ایک مجبور ولاچار ضعیف بنگالی عورت ہے۔ جس کا شوہر قیام پاکستان کے وقت شہید ہوا۔ مزمل اس عورت کی مدد کرتا ہے اور اس کی دوا اور کھانے کا انتظام کرتا ہے۔ مگر ان حالات میں وہ کافی دن تک ہاجرہ کی خبر گیری نہ کر سکا جس وجہ سے وہ اس کے متعلق بہت فکر مند رہا۔ اس لیے اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر ہاجرہ کی خبر گیری کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے کھانا لے کر گیا۔ حالات کی ناسازی کے سبب اس کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ قریب مسجد سے جا کر پانی بھر لائے مگر اس نے پھر بھی بہادری کا مظاہرہ کیا۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> وہ اٹھ کر چلا تو اندھیرے میں پیال کے پاس پڑی ٹھلیا کو ٹھوکر لگی۔ ایک بوند پانی بھی تو نہ تھا۔ سوکھی ٹھلیا دیکھ کر اس کا دل کانپ اٹھا۔ ایک کربلا کا علم دار تھا کہ دن دہاڑے خالی مشک کاندھے پر لٹکا کر ایک فوج کے نرغے میں گھستا چلا گیا کہ اسے پیاسوں کا حلق تر کرنا تھے۔ اور ایک میں ہوں۔۔ ایک میں ہوں۔۔ ایک میں ہوں! سوکھی ٹھلیا اٹھائے ان جانے میں اس کے قدم بڑھتے چلے گئے۔[۴۹]

رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے مطابق مثالی مرد بہادر ہوتا ہے۔ وہ ہر قسم کے حالات کا جواں مردی اور ہمت سے مقابلہ کرتا ہے۔ مزمل بھی ایسا ہی کردار ہے وہ ہمت و حوصلہ نہیں ہارتا۔ ہاجرہ کے لیے کھانے پینے کا انتظام کرنے کے بعد مزمل نے اس بات کا فیصلہ کر لیا کہ وہ اب اس گھر میں نہیں رہیں گے بلکہ حالات کا جرات مندانہ انداز میں مقابلہ کر کے زندگی گزاریں گے۔ وہ انسانوں کی طرح مرنے کا حوصلہ رکھتا ہے یوں چھپ کر مرنا نہیں چاہتا۔ مزمل نہیں چاہتا کہ بذلل اور مرلی اس کی وجہ سے کسی مشکل کا شکار ہوں۔ مزمل دوسری مرتبہ اپنا گھر بار چھوڑ رہا تھا پہلی مرتبہ قیام پاکستان کے وقت اور دوسری مرتبہ سقوط ڈھاکہ کے وقت۔ یہ ایک ایسا چلتا مسافر تھا جس کو قیام میسر نہ تھا۔ مزمل بھیس بدل کر گھر سے نہ نکلا وہ نہیں چاہتا تھا کہ بھیس بدل کر کسی کی آنکھوں میں دھول جھونکے۔ مزمل میں حالات کا جواں مردی کے ساتھ مقابلہ کرنے جیسے تذکیری خصائص پائے جاتے ہیں۔

آخر میں جب مدثر پاکستان چلا گیا تو مزمل پھر سے متحرک ہو گیا۔ اس نے کیمپ کے ساتھیوں کی مدد کرنے کی ٹھانی۔ بدرالدین کی جو بیٹیاں اغواء ہو گئی تھیں ان کی بازیابی کے لیے کوشش کی اور اپنی جان دے دی۔ یہ ایک ایسا

بے ضرر شخص ہے جس نے مرد مومن کی طرح زندگی بسر کی اور مر کر شہادت کا رتبہ حاصل کیا۔ مزمل میں انسانی ہمدردی اور بہادری جیسی تذکیری صفات پائی جاتی ہیں۔ تسنیم آصف لکھتی ہیں: "چلتا مسافر میں مرکزی کردار مزمل ہے۔ یہ کردار بہت حد تک مثالی ہے۔ اس میں اعلیٰ انسانی خصوصیات موجود ہیں مگر یہ کردار پُر کشش نہیں بن سکا۔"[۵۰]

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مزمل کے کردار میں رابرٹ ووڈ کی تھیوری کے مطابق بہادری و شجاعت، انسانی ہمدردی اور لوگوں کی مدد کرنا، صبر کرنا اور مشکل حالات کا جواں مردی سے مقابلہ کرنا اور حقیقت پسند سوچ جیسے تذکیری خصائص پائے جاتے ہیں۔ یہ ایک مثالی کردار ہے جو تذکیری تھیوری پر پورا اترتا ہے۔

بذلل الرحمٰن:

بذلل الرحمٰن ناول کا متحرک اور جاندار کردار ہے۔ یہ بنگالی مسلمان لڑکا ہے جو مزمل کے گھر کے قریب رہتا ہے۔ بذلل اپنی سوتیلی ماں کے ظلم و ستم کا شکار ہو کر دل برداشتہ ہو جاتا ہے۔ اس کے والد رحمٰن صاحب پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں وہ بھی بذلل کو وقت اور محبت نہیں دے پاتے اور وہ محبت اور شفقت کی تلاش میں مزمل کے گھر کا رخ کرتا ہے:

> بذلل کی سوتیلی ماں کھانا اس انداز سے میز پر پٹختی تھی کہ مچھلی کے کباب، تلے ہوئے جھینگے اور مچھلی پلاؤ بھی زہر لگنے لگتا تھا۔ برسوں تو اس نے آنسوؤں کی نمی کے ساتھ نوالے حلقے کے نیچے اتارے تھے۔ پر اب تو عادی سا ہو گیا تھا۔ سر جھکا کر کھا لیا کرتا تھا۔ وہ بک بک جھک جھک سے گھبراتا تھا۔ جب ہی تو چھت کے پنکھے کی ہوا کو چھوڑ کر مزمل کے کمرے کی میز پر رکھے پرانے پنکھے کی ہوا میں لیٹ کر گھنٹوں سوتا رہتا تھا۔[۵۱]

بذلل کے کردار کی ایک خوبی یہ ہے کہ اتنی سختی اور برے سلوک کے باوجود بھی اس کی شخصیت میں کسی منفی پہلو نے جنم نہیں لیا بلکہ اس کی شخصیت میں انسانی ہمدردی جیسے پہلو اجاگر ہوئے۔ یہ ایک ایسا رویہ ہے کہ جب کسی شخص کے ساتھ کچھ برا ہوتا ہے یا وہ ذہنی یا جسمانی تشدد کا شکار ہوتا ہے تو اس میں رد عمل کے طور پر تشدد کا عنصر جنم لیتا ہے مگر بذلل کے کردار میں اس منفی رویے نے جنم نہیں لیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مزمل کے گھر سے اس کو بہت محبت ملی اور مزمل سے ہی اس نے تعلیم بھی حاصل کی۔ بذلل نے ڈھاکہ یونی ورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ یونی ورسٹی میں اسے ایک پنجابی لڑکی سلسبیل سے محبت ہو گئی مگر اس نے اپنی محبت کا اظہار نہ کیا۔ یہ ایک ایسا تذکیری رویہ ہے جو ہمارے معاشرے میں پایا جاتا ہے کہ مرد اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہیں چاہے خوف کے جذبات ہوں، دکھ درد کے یا پھر محبت کے وہ اس کا اظہار نہیں کرتا کیوں کہ اس سے اس کی تذکیریت کو نقصان پہنچتا ہے۔ ہمارا معاشرہ مردوں کے لیے جارحانہ رویوں کی وضاحت کرتا ہے۔ عورت کے لیے یہ تصور کیا جاتا ہے کہ اسے اپنے

جذبات واحساسات پر قابو پانا نہیں آتا۔ لیکن ناول میں سلسبیل اور بذلل دونوں کا کردار مضبوط و جاندار ہے۔ دونوں اپنے جذبات پر قابو رکھنا جانتے ہیں۔ بذلل کے کردار میں بھی اپنے جذبات پر قابو پانا جیسی تذکیری صفت موجود ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سلسبیل اپنے تایازاد سلمان کی منگیتر تھی اور ان دونوں کے رشتے کے مابین یہ خلیج حائل تھی۔ سلسبیل کو بھی بذلل کی خاموش محبت کا اندازہ تھا اور وہ خود بھی بذلل کی محبت میں گرفتار تھی۔ اس لیے پاکستان پہنچنے کے بعد وہ بذلل کے بارے میں اس طرح سوچتی ہے:

> میں بھی جھوٹی ہوں اور شاید تم بھی جھوٹے تھے۔ نہیں نہیں۔ وہ جھوٹا نہیں تھا۔ اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اس نے مجھ سے کبھی کچھ نہیں کہا۔ تمہارے لبوں کی خاموشی اور تمہاری آنکھوں کا تکلم ہی تو مجھے کھا گیا۔ [۵۲]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بذلل نے تذکیری رویہ اپناتے ہوئے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا اور سلسبیل سے اپنی محبت کا اظہار نہ کیا۔ تشدد کا تذکیریت سے گہرا تعلق ہے۔ تشدد اور جارحیت کو روایتی تذکیری منفی پہلو تصور کیا جاتا ہے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ پر تشدد ثقافت میں پرورش پانے والے مرد تشدد کے ذریعے سے ہی تنازعات و فسادات کو حل کرتے ہیں۔ بذلل ناول کا جاندار اور متحرک کردار ہے۔ یہ فساد و انتشار کے خلاف امن و آشتی کا قائل ہے۔ بذلل قائداعظم سے بہت عقیدت رکھتا ہے۔ اس میں بھائی چارے کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ جب سقوط ڈھاکہ کا واقعہ رونما ہوا تو اس وقت بذلل لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ وہ بنگالی ہونے کے باوجود بنگالیوں کی بہاریوں کے ساتھ نفرت و حقارت کو غلط تصور کرتا ہے۔ اس حوالے سے وہ اپنی سوتیلی ماں اور اس کی ساتھی خواتین جو بہاریوں سے نفرت کرتی ہیں انھیں پسند نہیں کرتا۔ وہ بھیس بدل کر لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ اس حوالے سے مرلی نے مزمل صاحب کو بتایا:

> انکل، بذلل ان کے بس کا ہے؟ اس کا اب کوئی پتا نہیں ملتا۔ اس کے اندر بجلی سی بھر گئی ہے۔ وہ کب کہاں ہوتا ہے، کوئی نہیں بتا سکتا۔ کبھی وہ کسی بدھ بھکشو کے بھیس میں لپک لپک کہیں جاتا مل جاتا ہے۔ کبھی کسی یورپین کی طرح نظر آتا ہے۔ کبھی اس کے کندھے پر بڑا سا تھیلا ہوتا ہے۔ کہتا ہے، بھوکوں کو روٹی دینے جا رہا ہوں۔ [۵۳]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بذلل کے کردار میں جارحیت اور تشدد جیسی منفی تذکیری صفات نہیں پائی جاتیں۔ بلکہ وہ ایک حساس دل کا مالک ہے اور لوگوں کی مدد کرنے جیسی تذکیری صفت کا حامل ہے۔ بذلل مزمل کو اپنا محسن سمجھتا ہے اور وہ ان کشیدہ حالات میں مزمل اور اس کے خاندان کی مدد کرتا ہے۔ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ مزمل یہ گھر چھوڑ کر کہیں نہ جائے۔ مگر مزمل ایک بہادر شخص ہے وہ بزدلی کی زندگی گزارنا نہیں چاہتا اور وہ کیمپ میں جا کر رہتا ہے۔ بذلل 'مزمل کے خاندان کی کیمپ میں بھی مدد کرنے سے پیچھے نہیں ہٹتا۔ وہ شجاعت و بہادری کا مظاہرہ

کرتے ہوئے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر مدثر کو پاکستان بھجوانے کے انتظامات کرتا ہے۔اس میں قائدانہ صلاحیت جیسی خصوصیت بھی پائی جاتی ہے۔وہ مرلی، سمیع اللہ اور دیگر لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے کہ وہ جذبہ انسانیت کے تحت لوگوں کی مدد کریں۔اس حوالے سے اس کے ماتحت کام کرنے والے اور بذلل خود بھی اپنی جان کی پرواہ نہیں کرتا اور ان مشکل حالات کا جواں مردی سے مقابلہ کرتے ہیں:"میں آپ کی اور اپنی جان خطرے میں ڈال کر یہاں بیٹھا ہوں، صرف ایک جان کو محفوظ جگہ پہنچانے کے لیے۔"[۵۴]

رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے تناظر میں دیکھا جائے تو بذلل میں صبر، شجاعت و بہادری، لوگوں کی مدد کرنا، قائدانہ صلاحیت اور مشکل حالات کا جواں مردی سے مقابلہ کرنے جیسے خصائص پائے جاتے ہیں۔اس حوالے سے یہ کردار ناول کا مضبوط اور جاندار کردار ہے۔بذلل 'مزمل صاحب کو شہید کرنے والوں کے لیے حقارت کا اظہار کرتا ہے اور انھیں خود دفناتا ہے۔اس وقت کسی کو دفن کرنا بھی یا اس کا نماز پڑھانا بھی ایک مشکل مرحلہ تھا مگر بذلل نے ایسا کیا۔اس نے ظلم و ناانصافی کے خلاف جہاد کیا۔مگر اس نے نہایت عقلمندی کے ساتھ ہوش و ہواس میں رہتے ہوئے یہ کام کیا۔بقول ڈاکٹر ممتاز احمد خان:

> بذلل الرحمٰن جو اپنی بساط بھر بہاریوں کو قتل ہو جانے سے تحفظ فراہم کرتا ہے اور خود بھی اپنی جان کو انتہا پسندوں کے آگے مستقل خطرے میں ڈالے رکھتا ہے وہ بہاریوں کو سابق مغربی پاکستان بھی بھجوانے کا پر خطر اور جان لیوا کام انجام دیتا ہے۔یعنی ایک آدرش اس کا بھی ایمان و عقیدہ ہے۔[۵۵]

سید مبشر (سید صاحب):

سید صاحب کا کردار ناول میں مضبوط اور نمایاں ہے۔ان کا ذکر ناول کے ابتدائی حصے میں ہے۔یہ علی گڑھ سے تعلیم یافتہ ہیں۔انھوں نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنی خدمات پیش کیں۔فسادات والے علاقوں میں جا کر لوگوں کی مدد کی اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے کام کیا۔سید صاحب جانتے ہیں کہ بہار میں مسلم آبادی اکثریت میں نہیں ہے مگر پھر بھی وہ قیام پاکستان کے لیے خود غرضی سے بالاتر ہو کر محنت و کوشش کرتے رہے۔وہ ان تمام حالات کا فہم رکھتے ہیں جن کا انھیں پاکستان بننے سے پہلے اور بعد میں سامنا کرنا پڑے گا۔مگر وہ اپنے مقصد سے پیچھے نہیں ہٹتے۔وہ ایک قابل قائد بھی ہیں۔ان کے گھر میں اس مقصد کے لیے مختلف اوقات میں میٹنگیں ہوا کرتی تھیں۔سید صاحب اپنے دوست امیر حیدر جو کہ دوسری پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں ان کو کہتے ہیں:

> امیر حیدر، تم سمجھتے ہو میں یا بہار کے یہ تمام بڑے زمیندار اور مقتدر گھرانے نتائج سے بے خبر ہو کر پاکستان کی حمایت کر رہے ہیں۔ہم کسی خیالی جنت میں نہیں بیٹھے ہیں۔یہاں پر ہماری تہذیبی اور مذہبی زندگی کی آبرومندانہ ضمانت اب اس صورت میں ملے گی کہ جب مسلم اکثریت کے

صوبوں کو حق خود داری مل جائے گا۔ ہماری جماعتی اور ملی وجود کی یہی ایک ضمانت نظر آتی ہے۔[۵۶]

سید صاحب کی شخصیت میں ایک خصوصیت یہ پائی جاتی ہے کہ وہ اختلافات کو بڑے صبر و تحمل سے برداشت کرتے اور پھر ان کا جواب دلائل سے دینے کی کوشش کرتے۔ وہ اپنے بیٹے مزمل کو بھی اختلافات کو صبر و تحمل سے برداشت کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ جب سید صاحب کے دوست امیر حیدر پاکستان کے حوالے سے یہ بات کرتے ہیں کہ پاکستان کا کیڑا جناح کے دماغ میں رینگا ہے تو اس کی جڑ انگریز ہے۔ اس حوالے سے سید صاحب جارحانہ رویہ اختیار نہیں کرتے بلکہ وہ صبر و تحمل سے امیر حیدر کو لالہ لاجپت کی ان تحریروں کی طرف یاد دہانی کرواتے ہیں جس میں انھوں نے مسلمان کی اکثریت والے علاقوں کو الگ ریاست بنانے کی تجویز دی تھی۔ سید صاحب ہر طرح کے تعصب سے پاک انسان ہیں۔ سیاسی اختلافات کے باوجود بھی کانگریسی اور جن سنگھی ان کے دوستوں میں شامل ہیں۔ سید صاحب اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ وہ ان تمام دقیانوسی تصورات اور رسم و رواج کے خلاف ہیں جنھیں ہندوؤں کے اثر سے مسلمانوں نے اپنایا۔ اسی لیے نصیبا کی دوسری شادی پر وہ اصرار کرتے ہیں۔ وہ بیوہ کی دوسری شادی نہ کرنے کے خلاف ہیں۔ رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے مطابق مثالی مرد ہر لحاظ سے بہتر ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر اپنی توجہ دیتا ہے محض کسی ایک جانب توجہ نہیں دیتا۔ وہ اپنی بصیرت کے توسط سے مشکل حالات کو حل کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو سید صاحب جہاں سیاسی معاملات کو نہایت دل چسپی سے دیکھتے ہیں وہیں وہ اپنے گھر کے معاملات کو بھی پس پشت نہیں ڈالتے۔ ان کا رعب و دبدبہ اپنے گھر پر قائم ہے۔ انھوں نے بیرونی معاملات کے باوجود اپنی اولاد کی طرف سے بے توجہی اختیار نہیں کی بلکہ انھوں نے اپنے بیٹوں کے ساتھ ساتھ بیٹیوں کو بھی علی گڑھ سے تعلیم دلوائی۔ وہ اس زمانے کے ان تصورات کو تسلیم نہیں کرتے جہاں مردوں اور عورتوں کے مابین سماجی تصور کی بناء پر تفریق کی جاتی ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ ان کے گھر والے، ان کی اولاد اور دیگر لوگوں میں ان کو ایک خاص مقام حاصل ہے جو کہ ان کے تذکیری ہونے کی دلالت کرتا ہے۔ سید صاحب کے کردار میں صبر و حوصلے جیسی تذکیری صفات پائی جاتی ہیں۔ اس کا مظاہرہ انھوں نے اپنے بڑے بیٹے مدثر کے شہید ہونے پر کیا۔ انھوں نے مدثر کا نماز جنازہ پڑھایا۔ نصیبا بھی سید صاحب کا حوصلہ دیکھ کر تڑپ اٹھی:

> سفید کرتے پاجامے میں ملبوس جو سفید ریش شخص نماز جنازہ پڑھانے کو کھڑا ہوا تھا، اس کی صورت صاف نظر نہ آتی تھی۔ نصیبا نے اپنی دھوتی میں آنسو جذب کیے اور غور سے دیکھا تو اس کو چکر سا آگیا۔ دیارے دیا! سرکار میاں جنازہ پڑھاوت ہیں پوت کا! ارے، ہمرا کریجوا!۔[۵۷]

سید صاحب کے کردار میں صبر، دوسروں کی مدد کرنا اور قائدانہ صلاحیت جیسے تذکیری خصائص پائے جاتے ہیں۔

مدثر:

مزمل کا بیٹا مدثر مہذب اور خاندانی لڑکا ہے۔ یہ جاندار اور متحرک مرد کردار ہے۔ مدثر مشرقی پاکستان میں پیدا ہوا اور وہیں سے تعلیم حاصل کی۔ مدثر یونی ورسٹی میں ہونے والی سیاست پر کڑھتا ہے کہ یونی ورسٹی میں پڑھائی کے بجائے سیاست ہوتی ہے۔ مدثر مشرقی پاکستان کے حالات کی کشیدگی کے باعث بالکل تنہا ہو گیا مگر اس نے صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ وہ سوچتا ہے: "میں غمگین ہوں گا تو میری ماں کڑھے گی، میرے باپ کا دل ٹوٹے گا ۔میری بیمار دادی کیا محسوس کرے گی! اسی لیے وہ زبردستی ہنستا بولتا اور لطیفے سناتا رہتا تھا۔"[۵۸] اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مدثر میں صبر جیسی تذکیری خصوصیت موجود ہے۔

مردوں کی غالب تصویر مسابقت اور قوت و طاقت سے وابستہ ہے۔ مردوں سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ جب وہ پریشان ہوں تو اپنے جذبات کا اظہار کریں۔ یہاں مدثر کی بلند ہمتی کو دکھایا گیا ہے اس اقتباس سے اس پہلو پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ یہ محض اپنے متعلق نہیں سوچتا اس میں دوسروں کی خاطر جینے کا جذبہ موجود ہے مزید برآں اپنے جذبات کو پوشیدہ رکھنا یا دبا لینا بھی تذکیری صفت ہے جو مدثر میں موجود ہے۔

مدثر ایک جاندار کردار ہے۔ اس میں زندہ رہنے کی امنگ ہے۔ زندہ رہنے کے لیے وہ ہر طرح کے حالات کا شجاعت و جواں مردی سے مقابلہ کرتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے باپ مزمل کو بھی منا لیتا ہے کہ وہ پاکستان جائے گا چاہے اس کے لیے کتنی ہی مشکلات در پیش ہوں۔ اسی لیے جب بذل الرحمٰن اسے دوبارہ اپنے فیصلے پر غور کرنے کے لیے کہتا ہے کیوں کہ اسکیپ میں بہت خطرہ ہے تو مدثر اس کا جواب کچھ اس طرح سے دیتا ہے:

> نہیں۔ میں زندہ انسان کی طرح مرنا بہتر سمجھتا ہوں۔ زندہ لاش بن کر اپنے ٹکڑے نہیں کروا ؤں گا۔ ٹھیک ہے سفر بہت کٹھن ہے۔ قدم قدم پر موت پہرا دے رہی ہے۔ یاد ہے چچو ہم کو سنایا کرتے تھے: مسافر کو سفر میں ہیں رنج بہت۔[۵۹]

اپنے نظریے اور بات پر قائم رہنا بھی تذکیری خصوصیت ہے۔ مرد میں یہ خصوصیت ہونا ضروری ہے کہ وہ خوف و ہراس کے سبب اپنے فیصلے سے پیچھے نہ ہٹے بلکہ ہمت کر کے اپنے فیصلے پر قائم رہے۔ مدثر نے بھی ایسا ہی کیا وہ خوف و دہشت کے باعث اپنے فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹتا۔ اس کا فیصلہ اٹل ہے۔ لہٰذا وہ ایک طویل اور تکلیف دہ سفر طے کر کے پاکستان پہنچتا ہے۔ مدثر کی شخصیت میں دھیما پن اور شریفانہ انداز دکھائی دیتا ہے۔ اس کی وجہ اس کی تربیت اور ماں باپ کی توجہ ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کی عدم توجہی کا شکار نہیں ہوا اس وجہ سے ہی اس کی شخصیت میں دھیما پن اور

لوگوں کے لیے ادب ولحاظ نظر آتا ہے۔ مزید برآں مشرقی اور مغربی پاکستان کے مابین حالات کی کشیدگی کے سبب ہجرت کرنا اور کٹھن حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے پاکستان پہنچنا اس کی بہادری کی دلیل ہے۔ سلسبیل اسٹیشن پر جب مدثر کو دیکھتی ہے تو اس کے متعلق سوچتی ہے: "اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم ایک جوئے خون عبور کر کے اس نئے سفر پر گامزن ہوئے ہو۔ آفرین ہے تمہاری خوش دلی اور آنکھوں میں جھمکتے عزم حیات پر! میں تمہارے حوصلوں کو سلام کرتی ہوں۔"[۶۰]

مدثر کے کردار کے حوالے سے ڈاکٹر نجمہ صدیق کہتی ہیں:

> مدثر کا کردار واحد کردار ہے جس کے ذریعے الطاف فاطمہ نے 'چلتا مسافر' کے موضوع کو زیادہ وسیع پیمانے پر بیان کیا ہے۔ اگرچہ یہ کردار تھوڑے عرصے کے لیے ناول میں جلوہ گر ہوتا ہے لیکن بہت زیادہ پر تاثیر اور اہمیت کا حامل کردار ہے۔[۶۱]

رابرٹ ووڈ کی تھیوری کے مطابق مدثر کے کردار میں تذکیری خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ وہ مشکل حالات پر صبر بھی کرتا ہے اور ان کا مقابلہ بڑی بہادری اور جواں مردی سے کرتا ہے۔ وہ خوددار ہے اور اس میں کچھ کر گزرنے کا حوصلہ ہے۔ وہ بزدلوں کی طرح مرنے کا قائل نہیں ہے۔

مرلی:

مرلی ناول کا ضمنی کردار ہے یہ ہندو بنگالی ہے۔ بذل الرحمٰن کا دوست ہے۔ اس کے ساتھ مل کر لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ مرلی کے کردار کو ناول میں مختصر طور پر پیش کیا گیا ہے مگر یہ اس حوالے سے ایک اہم مرد کردار ہے کہ جب مشرقی پاکستان کے حالات خراب ہوتے ہیں اس وقت وہ مزمل کے گھرانے کی مدد کرتا ہے۔ وہ چھپ کر انھیں راشن پہنچاتا ہے اور انھیں مشورہ دیتا ہے کہ وہ گھر سے باہر نہ نکلیں۔ وہ اپنی جان کی پرواہ نہیں کرتا۔ اس کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

> ہاں تم بھول گئے ہو کہ تم بھی انسان ہو، آدم کی اولاد۔ گولی اور تیز دھار ہتھیار تم پر اثر کر سکتے ہیں۔ اب حالات اس قابل نہیں رہے ہیں۔۔۔
> ارے نہیں، اس نے بات کاٹ دی۔ ایسی کوئی بات ہوتی تو میں آسکتا تھا؟ سب ٹھیک ہو جائے گا۔[۶۲]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرلی اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر مزمل کے گھرانے کی مدد کرتا ہے۔ دوسروں کی مدد کرنا ایک تذکیری رویہ ہے جو مرلی میں موجود ہے۔ سقوط ڈھاکہ کے وقت مکتی باہنی کی تحریک چلی جنھوں نے بہاریوں کے قتل کا بازار گرم کیا۔ اس لیے تمام بنگالیوں کے متعلق یہ تصور کیا جاتا تھا کہ وہ اسی تحریک سے وابستہ ہیں اور وہ بہاریوں کے ساتھ مخلص نہیں ہیں۔ مگر ایسا نہیں تھا بنگالیوں میں بھی بہت سے لوگ ایسے پائے

جاتے تھے جنھوں نے مخفی طور پر بہاریوں کی مدد کی۔ مرلی کے متعلق بھی مزمل کی بیوی راشدہ بیگم کی ابتدا میں یہی سوچ تھی کہ وہ ایک تو ہندو ہے دوسرا بنگالی ہے تو وہ ہماری مدد کیوں کر کرے گا۔ اس لیے وہ اس سے خوف زدہ تھی۔ مگر مرلی کا کردار ایسا نہیں ہے۔ وہ تشدد کا رویہ اختیار کرنے کے بجائے تشدد کو روکتا ہے اور مزمل کے گھرانے کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگوں کی مدد بھی کرتا ہے۔ رابرٹ ووڈ اپنی تذکیری تھیوری میں مثالی آدمی کے ضمن میں ایک خصوصیت یہ بھی بیان کرتا ہے کہ مثالی آدمی تشدد کو روکتا ہے جب کہ غیر مثالی یا وولن کا کردار تشدد کو تلاش کرتا ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو مرلی کے اندر تشدد کے خلاف مزاحمت جیسی تذکیری صفت موجود ہے۔ ڈاکٹر عظمت رباب اور ڈاکٹر محمد خاں اشرف مرلی کے کردار کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> حالات بدلے تو لوگوں کے تیور بھی بدل گئے لیکن بذلل اور اس کے دوست مرلی نے اس کٹھن وقت میں بھی لوگوں کی مدد کرنا نہ چھوڑی۔ مرلی نے سلسبیل کو خاموشی سے ایئر پورٹ پہنچا دیا جہاں سے وہ واپس پنجاب چلی گئی۔ مزمل کے گھرانے کو بحفاظت کیمپ تک پہنچانے کے جو انتظامات خاموشی سے کیے وہ اسی کی ہمت تھی۔ [۶۳]

مرلی مذہب و عقیدہ کے تعصب سے پاک کردار ہے۔ اس کے نزدیک سب سے بڑا عقیدہ انسانیت کا ہے۔ الطاف فاطمہ کے غیر مسلم کرداروں میں مرلی ایک ایسا کردار ہے جو انسانیت کی خاطر اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ تذکیری تھیوری کے مطابق مرد کردار صابر ہوتا ہے، مشکل حالات کا بہادری اور شجاعت سے مقابلہ کرتا ہے، وہ تشدد کو روکتا ہے اور بھلائی کو فروغ دیتا ہے۔ یہ تمام خصائص مرلی کے کردار میں پائے جاتے ہیں۔

سمیع اللہ:

سمیع اللہ کا کردار ناول میں مختصر عرصے کے لیے نظر آتا ہے مگر یہ ایک جاندار ضمنی کردار ہے۔ یہ کردار بذلل الرحمٰن کے ماتحت کام کرتا ہے۔ ملک میں حالات کی کشیدگی کے سبب جب بہاریوں کو قتل کیا جا رہا ہوتا ہے۔ اس وقت سمیع اللہ فلاحی کاموں میں شریک ہوتا ہے۔ وہ انتہائی سمجھدار اور معاملہ فہم شخص ہے۔ جب مدثر کو پاکستان پہنچانے کا فیصلہ کیا جاتا ہے تو سمیع اللہ اس فرض کو سرانجام دیتا ہے۔ وہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر مدثر کو اس کی منزل تک پہنچاتا ہے۔

رابرٹ ووڈ کی تھیوری کے مطابق دوسروں کی مدد کرنا، تشدد کو روکنا اور پر خطر حالات کا بہادری سے مقابلہ کرنا تذکیری خصوصیات میں شامل ہے۔ تشدد کو روکنا اور دوسروں کی مدد کرنا یہ صفات سمیع اللہ کے کردار میں بھی پائی جاتی ہیں۔ وہ مشرقی پاکستان کے خراب حالات میں کسی مفاد کے بغیر لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ سب سے اہم کام وہ

مدثر کو بحفاظت اس کی منزل تک پہنچاتا ہے۔ اس کے لیے وہ اپنی جان کو خطرے میں ڈالتا ہے اور بہادری سے ان حالات کا مقابلہ کرتا ہے۔

منظور الاسلام:

منظور الاسلام ایک بنگالی ضمنی کردار ہے۔ یہ امام مسجد ہے۔ یہ بھی بہاریوں کی مدد کرتا ہے۔ اس میں جرأت و بہادری جیسی تذکیری خصوصیت پائی جاتی ہے۔ یہ ہاجرہ کی بھی مدد کرتا ہے مزمل کے جانے کے بعد اس تک کھانا اور پانی پہنچاتا ہے اور جب مزمل کے جنازے کو پڑھانے کے لیے منع کیا جاتا ہے تو منظور الاسلام ہی اس وقت جرأت مندی کا ثبوت دیتے ہوئے مزمل کا جنازہ پڑھانے کا کہتا ہے:

> میں یہ جنازہ ضرور پڑھاؤں گا۔ اس لیے کہ یہ کسی منافق کا جنازہ نہیں ہے۔ ایک مسکین اور بے ضرر مسلمان کا جنازہ ہے، جو بہت سال پہلے ہمارے شہر میں پناہ ڈھونڈنے آیا تھا۔[۶۴]

اس اقتباس سے منظور الاسلام کی جرأت مندی و شجاعت دکھائی دیتی ہے جو کہ ایک تذکیری خصوصیت ہے۔

خواب گر:

ابراہیم:

ابراہیم ناول "خواب گر" کا مرکزی کردار ہے۔ اس ناول کی کہانی ابراہیم اور اس کے گھرانے کے گرد گھومتی ہے۔ ابراہیم گلگت بلتستان کے علاقے تبت خورد کا رہائشی ہے۔ اس علاقے کے لوگ انتہائی محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں۔ یہ لوگ میدانی علاقوں میں جا کر مختلف جگہوں پر مشقت طلب کام کرتے ہوئے بھی اپنی شرافت اور ایمان داری کو برقرار رکھتے ہیں۔ ابراہیم بھی اسی علاقے کا فرد اور اہم رکن ہے۔ اسے اپنے خاندان کی خاطر تیرہ برس کی عمر میں ہی میدانی علاقوں کا رخ کرنا پڑا۔ یہ بچوں کے کھیلنے کودنے کی عمر ہوتی ہے۔ مگر ابراہیم ہمت و حوصلے کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے خاندان کی کفالت کی خاطر میدانی علاقوں میں گیا۔ اس نے دل لگا کر محنت کی اور اپنی ایمان داری کی بدولت بیراگیری کی نوکری حاصل کی۔ یہ ملازمت ان کے علاقے میں بہت باعزت تصور کی جاتی تھی۔ اس ملازمت کو حاصل کرنے کے بعد بھی اس میں غرور نہیں آیا۔ وہ انتہائی عاجزی کے ساتھ دشوار گزار راستوں سے اور پہاڑوں کی ڈھلانوں اور پگڈنڈیوں سے ہوتا ہوا اپنے علاقے شگر پہنچتا ہے۔ وہ تیرہ برس کی عمر میں نیچے گیا اور پورے بائیس سال کا ہو کر اپنے علاقے میں واپس آیا۔ اس نے اپنی جوانی کے کئی سال محنت و مشقت میں بسر کیے۔ دراصل گلگت بلتستان کا معاشرہ اس حوالے سے تذکیری ہے کیوں کہ وہاں کے تمام مرد متحرک اور فاعل ہیں وہ نہ صرف اپنی ذات کے لیے محنت کرتے ہیں بلکہ اپنے علاقے کی ترقی کے لیے بھی کوشاں رہتے ہیں۔ ابراہیم بھی فاعل، محنتی اور متحرک کردار ہے۔ وہ خواب دیکھتا ہے اور اپنے خوابوں کی تعبیر حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ صرف اپنی

ذات یا اہل خانہ کے حوالے سے نہیں سوچتا بلکہ اپنے علاقے کی ترقی کے خواب بھی دیکھتا ہے۔ اسے اپنے علاقے سے بہت محبت ہے۔ اس نے اپنی زندگی کے کئی سال ان تھک محنت کر کے گزارے۔ ابراہیم کی بھابھی سکینہ ااور بھائی اسمٰعیل نے ماہ خاتون کو اس کے لیے پسند کیا۔ ماہ خاتون کا منگیتر کئی سال سے نیچے گیا اور پھر لاپتہ ہو گیا اس لیے ماہ خاتون کا باپ چاہتا تھا کہ جلد از جلد اس کی شادی کر دے۔ ابراہیم نے بڑی محبت اور چاہت سے اپنا کمرا تیار کیا اور ماہ خاتون کے ساتھ اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا۔

شادی کے بعد ابراہیم واپس اپنی ملازمت پر چلا گیا۔ جب وہ واپس لوٹا تو اس کی بیٹی چار سال کی ہو چکی تھی۔ ماہ خاتون نے اسے مجبور کیا کہ وہ دوبارہ نیچے میدانی علاقے میں جائے اور پیسہ کما کر لائے تا کہ وہ اپنا الگ مکان بنا کر پر سکون زندگی بسر کر سکے۔ چار و ناچار ابراہیم کو واپس جانا پڑا مگر اس مرتبہ جب وہ گھر لوٹ کر آیا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی اپنی چھوٹی سی بیٹی کو چھوڑ کر اپنے سابقہ منگیتر کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ ابراہیم کے لیے یہ صدمہ اذیت ناک تھا مگر اس نے بہت صبر و حوصلے سے کام لیا اور اپنے دکھ بھرے جذبات کو اپنے دل میں ہی چھپائے رکھا۔ وہ اپنے غم کو اس طرح چھپائے ہوئے تھا کہ کسی پر عیاں نہ ہو کہ وہ کتنا آزردہ دل ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر عظمت رباب اور ڈاکٹر صائمہ ارم لکھتی ہیں:

> ابراہیم کے لیے یہ صدمہ بہت جانکاہ تھا لیکن اس نے اس غم کو اپنے دل ہی میں چھپا لیا اور بہت صبر سے ماہ خاتون کا طلاق نامہ اس کے گھر بھجوا دیا اور اپنی بیٹی کو بھابھی سکینہ کے سپرد کر کے خود نیچے چلا گیا۔[۶۵]

اپنے جذبات پر قابو رکھنا اور صبر کرنا ایسے تذکیری خصائص ہیں جن کو ہمارا معاشرہ مردوں کے لیے متعین کرتا ہے۔ ابراہیم میں بھی یہ تذکیری خصائص پائے جاتے ہیں۔ ابراہیم میں مثبت سوچ پائی جاتی ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کی بیوی اپنے سابقہ منگیتر کے ساتھ ناجائز اور گناہ کی زندگی گزارے اس لیے وہ اسے طلاق دے دیتا ہے۔ یہ ایک مثبت تذکیری رویہ ہے وہ اس حوالے سے خود کو بھی قصوروار تصور کرتا ہے۔ وہ اپنی بھابی سکینہ کو بڑے حقیقت پسندانہ انداز میں کہتا ہے:

> وہ حق بجانب تھی، انتظار کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ ایک عورت روٹی کپڑے کے علاوہ کچھ اور بھی چاہتی ہے۔ پھر اس نے سکینہ کی طرف دیکھا اور دھیرے سے بولا، "بھابھی سکینہ یہ بات آپ نہیں سمجھ پاؤ گی، اس لیے کہ کاکا اسمٰعیل نے آپ کو آپ کا ہر حق دیا، عزت بھی، حفاظت بھی۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ عورت اور زمین دونوں ہی حفاظت اور اپنا حق مانگتی ہے۔[۶۶]

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابراہیم کے ہاں مثبت تذکیری سوچ پائی جاتی ہے وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ عورت کی حیاتیاتی ضروریات بھی ہیں جس کا خیال رکھنا مرد کی ذمہ داری ہے۔ یہ فطرت کا قانون ہے جس

سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اکثر مرد غیرت کے نام پر تشدد کا رویہ اختیار کرتے ہیں اور قتل کے مرتکب ہوتے ہیں۔ مگر ابراہیم نے یہاں تشدد کو روکا ہے اور اس حقیقت سے آشنا کروایا ہے کہ عورت کی ضروریات کو پورا کرنا مرد کا فرض ہے۔ رابرٹ ووڈ کی تھیوری کے مطابق ابراہیم میں صبر و تحمل، اپنے جذبات پر قابو پانا اور حقیقت پسندانہ سوچ جیسی تذکیری خصائص پائے جاتے ہیں۔

ابراہیم معاشرے میں بے جان اور غیر متحرک شخص بن کر زندگی گزارنے کا قائل نہیں ہے۔ وہ صبر اور بہادری سے کام لیتا ہے اور اپنی بیٹی ماہ رو کو اپنی بھابھی کی نگرانی میں دے کر میدانی علاقوں میں چلا جاتا ہے۔ وہ دوبارہ شادی نہیں کرتا اور تمام عمر ملازمت میں گزار دیتا ہے۔ یہاں اس کی شخصیت میں تنہائی پسندی کا رویہ پایا جاتا ہے۔ ابراہیم میں اپنے بھائی کی مدد کرنے کا جذبہ بھی موجود ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اب اس کا بھائی کمزور ہو گیا ہے۔ اس کو ان کی مدد کرنی چاہیئے۔ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کے اپنے پڑھنے کی خواہش تو پوری نہ ہو سکی مگر وہ محنت کر کے علی مردان کو ضرور پڑھائے گا۔ اس حوالے سے اقتباس درج ذیل ہے:

> اب میرا بھی فرض ہے، ان کے لیے زیادہ سے زیادہ آسانی پیدا کروں زیادہ روپیہ بھیج کر۔ وہاں بھائی اسمٰعیل اکیلے ہی محنت کرنے والا ہے۔ علی مردان تو ابھی چھوٹا ہے اور میری خواہش ہے کہ اگر میں زیادہ نہیں پڑھ سکا ہوں تو علی مردان تو اپنی تعلیم بے فکری سے پوری کرے۔[۶۷]

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم کے اندر یہ تذکیری خصائص ہیں کہ وہ محض اپنی ذات کے حوالے سے نہیں سوچتا۔ اس میں اپنے سے زیادہ دوسروں کے لیے جینے کا جذبہ موجود ہے۔ وہ ان کی مدد کرتا ہے اور اس کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔

ابراہیم جب نیچے کا سفر کرتا ہے تو دوران سفر اس کی ملاقات ایک انگریز افسر فریڈرک ہسٹن سے ہوئی۔ ابراہیم اور فریڈرک ہسٹن کے حالات قدرے مشترک ہیں۔ فریڈرک ہسٹن کی بیوی بھی اس کو چھوڑ کر اپنے کسی آشنا کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ اس لیے وہ اپنے بچوں کے حوالے سے بہت فکر مند ہے۔ اسے ابراہیم کی سادگی اور نیک سیرت بہت پسند آئی۔ اس لیے اس نے ابراہیم کو ملازمت کی پیش کش کی۔ ابراہیم نے ہمدردی اور اس کی مدد کی غرض سے نیم رضامندی ظاہر کی۔ بعد ازاں جب فریڈرک نے ابراہیم کو ملازمت پر بلانے کے لیے خط بھیجا تو اس کو پڑھوانے میں اس نے جلد بازی نہیں کی بلکہ صبر و قناعت سے کام لیا۔ اس حوالے سے الطاف فاطمہ ان کی خصوصیت کے بارے میں لکھتی ہیں:

> یہ بھی ان کے کردار اور مزاج کا ایک پہلو تھا کہ خوشی اور غم، حیرت اور غصے کی زبردست سہار تھی۔ کبھی کسی حال میں اپنے اضطراب، شوق کا ضرورت سے زیادہ اظہار نہ کرنا اور آپے سے باہر نہ ہونا۔[۶۸]

الطاف فاطمہ نے ناول میں اکثر جگہوں پر بلتیوں کے قومی کردار اور خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ ان کے سماج کا ہر فرد محنتی، جفاکش، حلیم اور صابر ہے۔ ابراہیم میں بھی یہ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ابراہیم نے دس سال فریڈرک ہسٹن کے پاس ملازمت کی اور اس کے بچوں کی دیکھ بھال اور پرورش کا کام سرانجام دیا۔ فریڈرک ہسٹن کی سوچ سے ابراہیم کی شخصیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

> بعض انسانوں کے اندر ایسی سچائی اور صداقت کا نور ہوتا ہے، جو اپنے قریب آنے والوں کے اندر اندھیروں کو بھی اجالوں میں بدل دیتا ہے۔ ان کی سچائی شراب کے سرور کی طرح ہمارے اندر اترتی چلی جاتی ہے۔ ان کا قرب بند زخموں کا منہ کھول دیتا ہے۔ درد و غم، گلے شکوے کا سارا زہر، مفید مواد کی طرح اس دہانۂ زخم کے راستے بہہ کر سچائی اور اخلاص کی راہ کھول دیتا ہے۔ اور آج مجھے احساس ہوا ہے کہ غم زدہ اور پریشان حال کس واسطے ولیوں اور درویشوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں اور ان کا قرب ان کی طمانیت کا باعث ہوتا ہے۔[۶۹]

ابراہیم کے حوالے سے فریڈرک کی سوچ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابراہیم دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہونے والا اور ان کی مدد کرنے والا شخص ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ابراہیم کے کردار میں جذبات پر قابو پانا، صبر کرنا، دوسروں کی مدد کرنا، تنہائی پسندی اور حقیقت پسندانہ سوچ جیسی مثالی تذکیری صفات موجود ہیں۔

اسمٰعیل:

اسمٰعیل 'ابراہیم کا بڑا بھائی ہے۔ اسمٰعیل نے اپنی خاندانی روایتوں کا پاس رکھتے ہوئے اپنے خاندان کی ذمہ داری کو نہایت احسن طریقے سے انجام دیا۔ اسمٰعیل محبت کرنے والا محنتی اور صابر شخص ہے۔ والد کی وفات کے بعد اس نے اپنی تمام زمینوں کی دیکھ بھال کی، محنت کر کے زمینوں کے قرض ادا کیے۔ اسمٰعیل نے اپنی بیوی سکینہ اور بھائی کے تمام حقوق ادا کیے۔ اسے اپنے بھائی ابراہیم سے بہت محبت ہے۔ جب ابراہیم کی بیوی ماہ خاتون اسے چھوڑ کر اپنے سابقہ منگیتر کے ساتھ بھاگ جاتی ہے تو ابراہیم اپنے بھائی اسمٰعیل کے حوالے سے اپنی بھابھی کو کہتا ہے:

> بھابھی سکینہ یہ بات آپ نہیں سمجھ پاؤ گی، اس لیے کہ کاکا اسمٰعیل نے آپ کو آپ کا ہر حق دیا، عزت بھی، حفاظت بھی۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ عورت اور زمین دونوں ہی اپنا حق مانگتی ہے، اور کاکا اسمٰعیل نے سب ہی کا حق ادا کر دیا ہے۔ وہ اپنے بھائی کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا "انھوں نے ماں باپ کا، میرا اور سب کا حق ادا کیا۔[۷۰]

اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسمٰعیل فرض شناس شخص ہے۔ وہ اپنی مفلسی کے باوجود بھی اپنے فرائض سے غفلت نہیں برتتا۔ وہ اپنے بھائی ابراہیم کے حوالے سے بہت فکر مند ہے اسی لیے اس نے ماہ خاتون کے متعلق کوئی بات نہیں کی اور اس حوالے سے خاموشی اختیار کر لی۔ کیوں کہ وہ اپنے بھائی کے جذبات سے خوب واقف ہے وہ جانتا

ہے کہ اس کا بھائی اپنے ساتھ ہونے والی بے وفائی پر دل برداشتہ ہے مگر وہ اپنے احساسات کو کسی پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔

اسمٰعیل نے گھر کے سربراہ کی حیثیت سے اپنے تمام فرائض ادا کیے۔ وہ چاہتا ہے کہ گھر کے تمام افراد مفاہمت سے رہیں۔ جب ابراہیم کی بیوی نے علیٰحدہ گھر کا مطالبہ کیا اس وقت بھی اسمٰعیل نے گھر کی تعمیر کے لیے ابراہیم کی مدد کا فیصلہ کیا۔ وہ عورت پر زبردستی ذمہ داریاں ڈالنے اور اپنا حکم مسلط کرنے کا قائل نہیں ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> میں نے اور ابراہیم نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہی ہو گا جیسا وہ چاہتی ہے۔ اس بار ہمارا یہی منصوبہ تھا کہ اس کی واپسی پر تعمیر کا کام شروع کر دیں گے اور اس کے ساتھ ہی میں زمین بھی ٹھیک کروں گا۔[۱۷]

ابراہیم نے ماہ رو کی تمام ذمہ داری اپنے بھائی اسمٰعیل کے سپرد کی۔ اسمٰعیل اور اس کی بیوی سکینہ نے اس کی پرورش میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور ماہ رو کو بہت محبت سے پالا۔ اسے ماں اور باپ دونوں کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ اس کی شادی اپنے بیٹے علی مردان سے کروا کر اس کا فرض ادا کیا۔ اس حوالے سے ابراہیم 'اسمٰعیل کا خط پڑھ کر یہ سوچتا ہے کہ کس کس کے فرض ادا کر رہے ہیں اسمٰعیل بھائی اللہ ان کو عمر دراز عطا فرمائے وہ کس کس کے فرض ادا کرتے رہیں گے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اسمٰعیل کا کردار بے ضرر شخص کا ہے۔ وہ کسی کو بھی رنج و تکلیف میں مبتلا نہیں دیکھ سکتا۔ وہ سب کو محبت دینا جانتا ہے۔ اور سب کے لیے ہمدردی اور محبت کے جذبات رکھتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی انتہائی محنت و مشقت کے ساتھ گزاری مگر ہمت نہیں ہاری۔ اس نے اپنے حالات پر صبر کیا اور یہی اس کی تذکیری خصوصیت ہے۔

علی مردان:

علی مردان ناول کا اہم مرد کردار ہے۔ یہ ابراہیم کو اپنا آئیڈیل مانتا ہے۔ علی مردان کو بھی اپنے چچا ابراہیم کی طرح گھر کے معاشی حالات کے سبب کم عمری میں ہی محنت و مشقت بھری زندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ غربت کے باعث تعلیم حاصل نہ کر سکا۔ البتہ اس نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی اور پھر اس نے ماہ رو کو بھی پڑھایا کہ وہ اس قابل ہو گئی کہ اخبار پڑھ سکے۔ وہ گھر کے معاشی حالات کو بہتر کرنے کے لیے نیچے میدانی علاقوں کی طرف گیا۔ نہ صرف گھر کے حالات بلکہ اس کی بھی ہر محب وطن کی طرح یہی سوچ تھی کہ اپنی سرزمین کو بھی فائدہ پہنچائے اور اس علاقے کے حالات بدلنے میں اپنا کردار ادا کرے۔ علی مردان لاہور میں آکر ہوٹل میں نوکری کرنے لگا وہ بیکنگ کا کام کرتا ۔ اپنی ایمان داری اور محنت کی وجہ سے وہ ہوٹل کا ایک ناگزیر رکن بن گیا۔ جیسا کہ مرد گھر کا حاکم ہوتا

ہے۔گھر کی تمام ذمہ داریوں کو پورا کرنا مرد کا فرض ہوتا ہے۔یہ ہمارا سماجی رویہ ہے کہ عورت کے سپرد گھر کی اندرونی ذمہ داریاں ہیں جب کہ مرد امور خارجہ کو دیکھتا ہے اور گھر والوں کی معاشی اور دیگر ضروریات پوری کرتا ہے۔اگر مرد ایسا نہ کر سکے تو وہ تذکیری خصائص کا حامل نہیں ہے۔وہ عورت پر زبردستی نہیں کر سکتا کہ وہ بھی معاشی مسائل کو حل کرنے کے لیے اس کی مدد کرے۔یہی صورت حال ہمیں ناول میں بھی نظر آتی ہے جب ماہ رو زمینوں پر کام کرنے سے انکار کرتی ہے:

> زمینوں کی حالت بھی کچھ اچھی نہ تھی،اس لیے کہ ماہ رو نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ زمین پر کام بالکل نہیں کرے گی۔اس کا خیال تھا کہ اس کا شوہر خود تو موج میلے میں ہے اور اب چاہتا ہے کہ وہ زمین پر کام کرے۔[۲]

ماہ رُو کا ایسا سمجھنا ہمارے سماج کی منفی سوچ کی عکاسی کرتا ہے کہ اگر مرد ملازمت کی غرض سے باہر گیا ہے تو وہ بے راہ روی کا شکار ہو اور عیش کی زندگی گزار رہا ہو۔علی مردان نے اپنے اہل خانہ کے لیے جفاکشی اور محنت کا مظاہرہ کیا۔اب اس کا مقصد بہت سا پیسہ کمانا تھا تاکہ گھر کے حالات بدل سکیں۔وہ اس بات پر بھی اکثر کڑھتا تھا کہ ہمارے علاقے کے لوگ نیچے میدانی علاقوں میں آکر اتنی محنت کرتے ہیں۔اپنی زندگیاں یہاں پر کام کر کے صرف کرتے ہیں۔مگر وہ اتنا پیسہ بھی نہیں کما سکتے کہ ان کے گھروں کے حالات میں بہتری آئے۔وہ اپنے بال بچوں سے دور رہ کر ان تھک محنت کر کے بھی ان کو آسودہ زندگی نہیں دے سکتے۔وہ اس حوالے سے پریشان ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کا علاقہ بھی ترقی کرے۔

علی مردان کی بیوی ماہ رُو بھی اپنی ماں کے نقش قدم پر چلتی ہے اور اپنے ایک دور کے رشتہ دار شاہ رخ سے محبت کرنے لگتی ہے۔شاہ رخ سکردو میں ٹھیکیداری کرتا ہے اور اکثر ان کے گھر آتا رہتا ہے۔وہ ماہ رو کی مالی مدد بھی کرتا ہے۔ایک دن خلیل 'ماہ رو کا بیٹا سکول سے واپس آیا تو اس نے اپنی ماں اور شاہ رخ کو کمرے میں دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پہ یقین نہ آیا اور اس نے خاموشی سے دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈی لگا دی۔اسی اثناء میں علی مردان بھی گھر پہنچ جاتا ہے اور سارے معاملے کو دیکھ کر اس پر صبر کرتا ہے اور اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ:

> یہ سب غلطی ہماری غربت اور بد حالی کی ہے۔عورت مجبور،بے بس اور بہت کمزور ہوتا ہے۔میری اپنی غلطی ہے کہ میں پیسہ کمانے کی دھن میں اپنی بوڑھی ماں اور جوان بیوی کو اکیلا چھوڑ کر چلا گیا اور پھر ان کی خبر گیری بھی نہ کر سکا۔یہ عورت جوان بھی تھی اور ضرورت مند بھی۔ہاں البتہ شاہ رخ کو اس کی تنہا جوانی اور ضرورت سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔[۳]

علی مردان بھی اپنے چچا ابراہیم کی طرح تشدد کا رویہ اختیار نہیں کرتا اور اپنے آپ کو بھی اس کا قصور وار سمجھتا ہے۔علی مردان میں رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے مطابق حقیقت پسند سوچ پائی جاتی ہے۔وہ اس حقیقت

کو تسلیم کرتا ہے کہ عورت کی بنیادی ضروریات کے علاوہ دوسری ضرورت بھی ہوتی ہے جس کو پورا کرنا مرد کے ذمے ہے۔ یہاں پر ماہ رو کو بے راہ روی اور گمراہی کے راستے پر چلنے کے باوجود بھی اسے عورت ہونے کا فائدہ حاصل ہے۔ دوسری جانب شاہ رخ کو ایک کم ظرف مرد کی صورت میں دکھایا گیا جو عورت کی مجبوری کا فائدہ اٹھاتا ہے۔

علی مردان ہمت و حوصلے سے کام لیتا ہے اور ماہ رو کو طلاق دے کر اپنی پھوپھی سے کہتا ہے کہ یہ اس گھر کی عزت ہے اور اس کا عزت کے ساتھ شاہ رخ سے نکاح کر دینا۔ وہ اپنے بیٹے اسمٰعیل خلیل اللہ کو لے کر شہر آجاتا ہے۔ جہاں اسے پہلے کسی کام پر لگا دیتا ہے مگر بعد میں شہلا اس کا داخلہ سکول میں کرواتی ہے تو پھر علی مردان محنت کر کے پیسہ کماتا ہے اور اپنے بیٹے کو ڈاکٹر بناتا ہے تاکہ وہ اپنے علاقے کے لوگوں کے لیے فلاح کا کام کرے۔

علی مردان محب وطن شخص ہے۔ اس نے تیئیس، چوبیس برس کی عمر میں جنگ کے حالات کو بھی دیکھا اور بڑے صبر اور حوصلے سے کام بھی لیا۔ اس کے اندر مدد کرنے کے جذبات بھی پائے جاتے ہیں اس لیے جب فوجی جوانوں کو خون کی ضرورت ہوئی تو وہ خون عطیہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ اقتباس درج ذیل ہے:

> کل صبح میں تجھے ریڈ کراس کے اندر لے چلوں گا۔ وہاں تم بھی اپنا خون دینا اور میں بھی دوں گا۔۔۔ اور ہاں علی مردان! تو سول ڈیفنس کی ٹریننگ لے لے۔ کل میں تجھے بھرتی کرواتا ہو۔[۴۷]

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو علی مردان ایک متحرک کردار ہے۔ اس نے اپنے تمام حالات کا بہادری سے مقابلہ کیا۔ رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے مطابق علی مردان میں حقیقت پسند سوچ، صبر و بہادری، مدد کرنا اور محنت و جفاکشی جیسے تذکیری خصائص موجود ہیں۔ جو کہ ایک کردار کو مثالی بناتے ہیں۔

اسمٰعیل خلیل اللہ:

اسمٰعیل خلیل اللہ علی مردان کا بیٹا ہے۔ ناول کے آخر میں اس کا ذکر مختصراً کیا گیا ہے اور اسی کردار پر ناول کا اختتام ہوتا ہے۔ یہ کردار اس لیے بھی اہم ہے کہ اس نے ابراہیم کے خواب کو پورا کیا۔ خلیل نے اپنے بچپن ہی سے مشکل اور کٹھن حالات کا سامنا کیا۔ وہ اپنی ماں کی محبت سے محروم رہا۔ اس کی وجہ اس کی ماں کی اس کے باپ کے ساتھ بے وفائی ہے۔ وہ پانچویں جماعت کے بعد ہی اپنے باپ علی مردان کے ساتھ میدانی علاقے میں آگیا۔ جہاں علی مردان نے اسے اپنے ایک درزی دوست کے پاس کام سیکھنے کے لیے چھوڑ دیا اور خود اسلام آباد چلا گیا۔ اس نے چھوٹی سی عمر میں ہی ماں باپ سے جدائی کا درد سہا۔ بعد ازاں خلیل نے ایک کینٹین میں کام کرنا شروع کیا۔ خلیل ذہین اور سمجھدار لڑکا ہے۔ اس کی زندگی میں مثبت تبدیلی شہلا کے ذریعے آئی۔ خلیل کو اپنی خودداری اور عزت نفس بہت عزیز ہے۔ ملازمت سے نکالے جانے کے بعد جب شہلا 'خلیل کو روزانہ پانچ روپے دینے کی پیش کش کرتی ہے تو خلیل

اسے کہتا ہے۔ "پر باجی ہم فقیر تو نہیں۔ کام کرے گا تو پیسہ لے گا۔"[۵۵] دراصل خلیل میں خودداری کے ساتھ ساتھ محنت و جفاکشی جیسی تذکیری صفات پائی جاتی ہیں۔ کم سنی میں ہی خلیل کی شخصیت میں مثبت سوچ پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے ہاتھ سے محنت کر کے روزی کمانے کا قائل ہے۔ شہلا خلیل کو اپنے گھر پر لائی اور اس کی توجہ پڑھائی کی طرف دلائی۔ خلیل اپنی پڑھائی میں مگن ہو گیا اور ساتھ ساتھ مکینک اور ڈرائیور کی ملازمت کرنے لگا۔ اس نے دن رات ایک کر کے محنت کی اور اپنی ڈاکٹری کی ڈگری مکمل کی۔ اس کے لیے وہ شہلا کا احسان مند رہا۔ کیوں کہ وہی خلیل کی محسن تھی جس کی وجہ سے وہ تعلیم کی راہ پر گامزن ہوا اور ڈاکٹر بن کر اس مقام پر پہنچا۔

خلیل لوگوں کے لیے ہمدردی کے جذبات رکھتا ہے اور وہ لوگوں کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ اس حوالے سے جب شہلا نے خلیل سے اس کے مستقبل کے منصوبے کے متعلق پوچھا تو اس کا کہنا تھا کہ: "سوچا تو یہی ہے کہ جو کچھ تھوڑا بہت حاصل کیا ہے، اس کا کچھ فائدہ اپنے لوگوں کو پہنچاؤں۔"[۵۶]

دراصل ان کا تعلق پس ماندہ علاقے سے ہے جہاں لوگوں کو سہولیات زندگی میسر نہیں۔ نہ ہی وہاں سکول و کالج ہیں اور نہ ہی ہسپتال۔ اس علاقے کے لوگ اپنے علاقے اور اہل خانہ کے بہترین مستقبل کے لیے ان تھک محنت کرتے ہیں۔ اسی غرض سے خلیل چاہتا ہے کہ وہ اپنے لوگوں کا علاج کر کے فلاحی کام کرے۔ وہ جب اپنے علاقے میں جاتا ہے تو اپنے علاقے میں ترقیاتی کاموں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے۔ خلیل بہت ہوشیار اور سمجھدار لڑکا ہے۔ اس کا ذکر ناول میں اجمالی طور پر کیا گیا ہے۔ اپنے علاقے سے دور رہنے کے باوجود بھی اس میں بلتیوں کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے مطابق خلیل میں لوگوں کی مدد کرنا جیسی صفت پائی جاتی ہے۔

فریڈرک ہسٹن:

فریڈرک ہسٹن ہندوستانی نژاد برطانوی شخص ہے۔ سیکرٹ سروس کا آفیسر ہونے کی وجہ سے وہ خانہ بدوشوں کی زندگی گزارتا ہے۔ فریڈرک ہسٹن فرنٹیئر کے علاقے میں پیدا ہوا اور اس کی پرورش زر بادشاہ اور گل خانم جیسے قبائلی افراد کے ہاتھوں میں ہوئی اسی لیے اس کی شخصیت دیگر انگریزوں سے مختلف ہے۔ وہ اپنے ملازموں کو دوسرے انگریزوں کی طرح حقیر نہیں سمجھتا بلکہ ان کے ساتھ محبت سے پیش آتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ابراہیم نے فریڈرک ہسٹن کی ملازمت کی پیشکش قبول کی۔ دوسرا ان میں ایک قدر مشترک تھی کہ دونوں کی بیویوں نے ان کے ساتھ بے وفائی کی۔ اس لیے ان کا غم بھی مشترک تھا۔ فریڈرک سات زبانوں کا ماہر ہے اور اسے شعر و ادب سے بھی لگاؤ ہے۔ فریڈرک ہسٹن کی اپنی بیوی سے متعلق یہ غلطی ہوئی کہ وہ اپنی بیوی سے وہی توقعات رکھتا جس طرح اس کی ماں نے زندگی گزاری وہ چاہتا تھا کہ وہ گھریلو ذمہ داریوں کو سنبھالے اور اس بات پر اعتراض نہ کرے کہ وہ اپنی ملازمت کی وجہ سے گھر کو وقت نہیں دیتا جب کہ یہ عہد اس سے بہت مختلف تھا جس عہد میں اس کی ماں نے زندگی

گزاری۔ یہاں دیکھا جائے تو فریڈرک ہسٹن حق بجانب نہیں ہے۔ کیوں کہ ہر شخص دوسرے شخص سے مختلف ہوتا ہے اور اس کے لیے اپنی شخصیت اور مزاج ہونے کی وجہ سے کسی دوسرے کی شخصیت کو اپنانا دشوار ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ام لیلیٰ کو بھی فریڈ سے اختلاف ہے اس حوالے سے وہ سوچتی ہے:

> ام لیلی کو ایک حد تک مارگریٹ سے اتفاق بھی تھا۔ اس حد تک جو شوہر اپنی ماؤں کے حوالے سے اپنی بیوی کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو پھر عورت کی فطرت میں حسد اور ضد دونوں ہی مادے تو موجود ہوتے ہیں اور ان کے رہ رہ کر سر اٹھانے کے امکانات بھی ہوتے ہیں۔[۷۷]

یہ فریڈرک ہسٹن کی شخصیت کا کمزور پہلو ہے کہ اس نے اپنی گھریلو ذمہ داریوں کو نہیں سمجھا جب کہ مثالی آدمی کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے تمام پہلوؤں کی طرف توجہ دے۔ محض صرف بیرونی معاملات کو نہ دیکھے بلکہ گھریلو معاملات پر بھی پوری توجہ دے۔

البتہ فریڈرک ہسٹن ایک حقیقت پسند انسان ہے وہ جانتا ہے کہ اس کی قوم نے برصغیر کی قوم بالخصوص پاکستانیوں کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے اور وہ اس سچائی کا اعتراف ان الفاظ میں کرتا ہے:

> ابراہیم مجھے احساس ہے، ہماری قوم میں مسلمان اقلیت کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ پاکستان کو اس کا جائز حق نہ دینے کے علاوہ وہ کشمیر کو بے وجہ ایک خوفناک مسئلہ بنا دیا گیا اور اس کے بارے میں وہ فیصلہ نہ کیا جو ہندوستان کی مسلم ریاستوں کے حق میں کیا تھا یعنی ان سب کا تو الحاق خود بخود ہندوستان سے ہو گیا جب کہ کشمیر کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ خیر، شکر ہے کہ تمہارے وطن کا بڑا حصہ آزاد ہو کر پاکستان سے مل گیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وقت گزرنے پر پر تمہارا وطن بلتستان تمہارے ان خوابوں کی تعبیر بن جائے گا جو تم اس کے لیے دیکھتے رہے کہ ان تمام خوابوں کو تعبیر میں ڈھلنے کے لیے وقت کا انتظار تھا۔[۷۸]

فریڈرک ہسٹن کے کردار کا مثبت پہلو ہے کہ وہ آقا ہو کر اپنی محکوم قوم کے ساتھ کی جانے والی اس زیادتی اور ناانصافی کا اعتراف کرتا ہے اس کی شخصیت کا یہ پہلو اسے دوسرے انگریزوں سے مختلف بناتا ہے ہے رابرٹ ووڈ کی تھیوری کے مطابق اس میں حقیقت پسندانہ سوچ جیسی تذکیری خصوصیت پائی جاتی ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو الطاف فاطمہ کے ناولوں کے بیشتر کرداروں میں تذکیری خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ جن میں دوسروں کی مدد کرنا، ذہنی اور تخلیقی لحاظ سے منفرد ہونا، صبر و ہمت، بہادری اور قائدانہ صلاحیت جیسی خصوصیات شامل ہیں۔ ان کے ناولوں کے مرکزی کردار مثالی آدمی کی تشکیل بھی کرتے ہیں۔ جیسے "چلتا مسافر" کے کردار مزمل اور بذلل الرحمٰن رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے مثالی آدمی کے ضمن میں آتے ہیں۔ اسی طرح "نشان محفل" کے کردار نادر حسین اور اویناش "دستک نہ دو" کا کردار صفدر یاسین اور

"خواب گر" کا کردار ابراہیم ان تمام کرداروں میں مثالی آدمی کی تذکیری خصوصیات وصفات موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ان ناولوں کے ضمنی کردار بھی تذکیری خصوصیات کے حامل ہیں۔ الطاف فاطمہ کے ناولوں کے کچھ کرداروں میں غیر تذکیری رویہ بھی موجود ہے مگر وہ بہت کم نظر آتا ہے اس رویے کے باوجود ان میں چند تذکیری خصائص بھی پائے جاتے ہیں۔

حوالہ جات

۱. ڈاکٹر اسلم آزاد، اردو ناول آزادی کے بعد (یوپی: نکھار پبلی کیشنز، ۱۹۸۱ء)، ص ۲۰۔۲۱۔

۲. سہیل بخاری، اردو ناول نگاری (دہلی: الحمرا پبلشرز، ۱۹۷۲)، ص ۲۷۔

۳. عظیم الشان صدیقی، اردو ناول- آغاز وارتقاء (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۸ء)، ص ۳۷۔

۴. احسن فاروقی، ناول کیا ہے (لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۰ء)، ص ۲۷۔

۵. الطاف فاطمہ، نشان محفل (لاہور: دارالبلاغ، س ن)، ص ۴۰۔

۶. سید جاوید اختر ،اردو کی ناول نگار خواتین :ترقی پسند تحریک سے دور حاضر تک (دہلی: بسمہ کتاب گھر، ۲۰۰۸ء)، ص ۱۶۹۔۱۷۰۔

۷. الطاف فاطمہ، نشان محفل، ص ۲۹۳۔

۸. بدرہ خاتون، پاکستانی ناول پر تقسیم ہند کے اثرات (مقالہ برائے ایم فل، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۴۸۔

۹. الطاف فاطمہ، نشان محفل (لاہور: دارالبلاغ، س ن)، ص ۳۳۰۔

۱۰. ایضاً، ص ۲۲۳۔

۱۱. ایضاً، ص ۲۶۳۔

۱۲. ایضاً، ص ۳۸۵۔۳۸۶۔

۱۳. تسنیم آصف ،الطاف فاطمہ کی ناول نگاری : فکری و فنی جائزہ (مقالہ برائے ایم فل، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد، ۲۰۰۴)، ص ۶۷۔

۱۴. الطاف فاطمہ، نشان محفل (لاہور: دارالبلاغ، س ن)، ص ۳۹۸۔

۱۵. ایضاً، ص ۳۹۹۔

۱۶. ایضاً، ص ۴۵۹۔

۱۷. ایضاً، ص ۳۷۔

۱۸. ایضاً، ص ۷۲۔

۱۹. ایضاً، ص ۴۳۱۔

۲۰. ایضاً، ص ۲۸۶۔

۲۱. ایضاً، ص ۴۲۰۔

۲۲. الطاف فاطمہ، دستک نہ دو (لاہور: فیروز سنز، س ن)، ص ۱۸۶۔

۲۳. ایضاً، ص ۵۵۰۔

۲۴. ایضاً، ص ۵۵۶۔

۲۵. ایضاً، ص ۷۸۲۔

۲۶. سید جاوید اختر ،اردو کی ناول نگار خواتین :ترقی پسند تحریک سے دور حاضر تک (دہلی: بسمہ کتاب گھر، ۲۰۰۸ء)، ص ۱۷۲۔۱۷۳۔

۲۷. الطاف فاطمہ، دستک نہ دو (لاہور: فیروز سنز، س ن)، ص ۶۱۶۔

۲۸. پرفیسر کنور نسیم، دستک نہ دو: مکمل شرح (لاہور: علی گڑھ پبلشرز، ۲۰۰۷)، ص ۴۵۔

۲۹. الطاف فاطمہ، دستک نہ دو (لاہور: فیروز سنز، س ن)، ص ۴۰۵۔

۳۰. ایضاً، ص ۴۱۷۔۴۱۸۔

۳۱. ایضاً، ص ۲۰۴۔

۳۲. ایضاً، ص ۲۹۶۔

۳۳. ایضاً، ص ۶۵۵۔

۳۴. سید جاوید اختر ،اردو کی ناول نگار خواتین :ترقی پسند تحریک سے دور حاضر تک (دہلی: بسمہ کتاب گھر، ۲۰۰۸ء)، ص ۲۱۳۔

۳۵. الطاف فاطمہ، دستک نہ دو (لاہور: فیروز سنز، س ن)، ص ۳۵۹۔

۳۶. سید جاوید اختر ،اردو کی ناول نگار خواتین :ترقی پسند تحریک سے دور حاضر تک (دہلی: بسمہ کتاب گھر، ۲۰۰۸ء)، ص ۱۷۱۔

۳۷. الطاف فاطمہ، دستک نہ دو (لاہور: فیروز سنز، س ن)، ص ۳۵۹۔۳۶۰۔

۳۸. ایضاً، ص ۴۰۲۔

۳۹. ایضاً، ص ۷۶۲۔

۴۰. پرفیسر کنور نسیم، دستک نہ دو: مکمل شرح (لاہور: علی گڑھ پبلشرز، ۲۰۰۷)، ص ۴۷۔

۴۱. الطاف فاطمہ، چلتا مسافر، (لاہور: جمہوری پبلیکیشنز، ۲۰۱۶ء)، ص ۵۶۔

۴۲. ایضاً، ص ۶۴۔

۴۳. ایضاً، ص ۱۲۸۔

۴۴. ایضاً، ص ۱۳۶۔

۴۵. ایضاً، ص ۱۵۴۔

۴۶. ایضاً، ص ۱۵۸۔

۴۷. ایضاً، ص ۱۹۷۔

۴۸. ڈاکٹر نجمہ صدیق، پاکستانی خواتین کے رجحان ساز ناول (لاہور: اظہار سنز، ۲۰۰۸)، ص ۲۵۷۔

۴۹. الطاف فاطمہ، چلتا مسافر (لاہور: جمہوری پبلیکیشنز، ۲۰۱۶ء)، ص ۲۱۵۔

۵۰. تسنیم آصف، الطاف فاطمہ کی ناول نگاری: فکری و فنی جائزہ (مقالہ برائے ایم فل، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد، ۲۰۰۴ء) ص ۱۳۹۔

۵۱. الطاف فاطمہ، چلتا مسافر (لاہور: جمہوری پبلیکیشنز، ۲۰۱۶ء)، ص ۱۴۷۔

۵۲. ایضاً، ص ۱۷۸۔

۵۳. ایضاً، ص ۲۱۱۔

۵۴. ایضاً، ص ۲۴۴۔

۵۵. ڈاکٹر ممتاز احمد خان، آزادی کے بعد اردو ناول: ہیئت، اسالیب اور رجحانات (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۷)، ص ۱۳۶۔

۵۶. الطاف فاطمہ، چلتا مسافر (لاہور: جمہوری پبلیکیشنز، ۲۰۱۶ء)، ص ۵۰۔

۵۷. ایضاً، ص ۱۲۲۔

۵۸. ایضاً، ص ۲۳۲۔

۵۹. ایضاً، ص ۲۵۳۔

۶۰. ایضاً، ص ۳۱۸۔

۶۱. ڈاکٹر نجمہ صدیق، پاکستانی خواتین کے رجحان ساز ناول (لاہور: اظہار سنز، ۲۰۰۸)، ص ۲۵۹۔

۶۲. الطاف فاطمہ، چلتا مسافر (لاہور: جمہوری پبلیکیشنز، ۲۰۱۶ء)، ص ۲۰۳۔

۶۳. ڈاکٹر عظمت رباب، ڈاکٹر محمد خان اشرف "آزادی کا تصور، ہجرت اور چلتا مسافر" مشمولہ نور تحقیق ج دوم، شمارہ ۳۳۔ ص: ۸۸

۶۴. الطاف فاطمہ، چلتا مسافر (لاہور: جمہوری پبلیکیشنز، ۲۰۱۶ء)، ص ۳۱۱۔

۶۵. ڈاکٹر عظمت رباب، ڈاکٹر صائمہ ارم، الطاف فاطمہ کے ناول خواب گر کا تجزیاتی مطالعہ "مشمولہ تحقیق نامہ، ش ۳۳۔ (جولائی تا دسمبر ۲۰۱۸ء): ص ۲۴۴۔

۶۶. الطاف فاطمہ، خواب گر (لاہور: جمہوری پبلیکیشنز، ۲۰۱۶ء)، ص ۳۴۔۳۵۔

۶۷. ایضاً، ص ۱۶۸۔

۶۸. ایضاً، ص ۱۶۷۔

۶۹. ایضاً، ص ۷۳۔

۷۰. ایضاً، ص ۳۴۔

۷۱. ایضاً، ص ۱۰۳۔

۷۲. ایضاً، ص ۲۲۶۔

۷۳. ایضاً، ص ۲۵۲۔

۷۴. ایضاً، ص ۲۴۳۔

۷۵. ایضاً، ص ۲۵۷۔

۷۶. ایضاً، ص ۲۶۹۔

۷۷. ایضاً، ص ۱۲۸۔

۷۸. ایضاً، ص ۲۱۱۔

باب چہارم:

الطاف فاطمہ کے ناولوں کے مرد کرداروں کے مکالماتی انداز تکلم کا جائزہ

باب چہارم:

الطاف فاطمہ کے ناولوں کے مرد کرداروں کے مکالماتی انداز تکلم کا جائزہ

زبان و بیان کسی بھی ناول کے واقعات اور کرداروں کو پیش کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔ناول نگار اپنی کہانی کو بیان کے ساتھ کرداروں کے مکالمات کے ذریعے بھی آگے بڑھاتا ہے۔ یہ ناول نگار کے خیالات و نظریات کو بیان کرنے اور اس کے مقصد کو حاصل کرنے کا وسیلہ ہوتا ہے۔ کرداروں کی حرکات و سکنات، جذبات، بول چال اور فکر کو زبان و بیان ہی سامنے لاتے ہیں۔ مکالمہ ناول نگاری کا اہم جز ہے یہ الفاظ اور جملوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ناول نگار کرداروں کی گفتگو کو مکالموں کی وساطت سے سامنے لاتا ہے جس سے ان کرداروں کے خیالات، جذبات اور احساسات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ان کے انداز تکلم سے ہی ہم کردار کے متعلق بہت کچھ جان سکتے ہیں۔

مکالمے کو پُر اثر اور عمدہ بنانے کے لیے ناول نگار کو زبان و بیان پر خصوصی توجہ دینی پڑتی ہے۔ناول چوں کہ ہماری حقیقی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔اس لیے اس کی زبان بھی حقیقی زندگی سے مطابقت رکھتی ہو۔ مکالموں کی زبان کا فطری ہونا ضروری ہے۔اس میں بناوٹ اور تصنع موجود نہ ہو۔یہی بہترین مکالمے کی خوبی ہے۔اس حوالے سے ڈاکٹر اسلم آزاد لکھتے ہیں:

> مکالمہ نگاری کی خوبی و کامیابی کا راز اس میں ہے کہ کرداروں کی باہمی گفتگو، ہماری عام زندگی کی گفتگو سے ملتی جلتی ہو۔انداز گفتگو یا لب و لہجہ میں ایسا تکلف اور تصنع نہ ہو کہ قاری اس کے غیر حقیقی ہونے کو محسوس کرلے۔ مکالموں کے لیے روانی، چستی اور بے تکلفی ضروری ہے۔ طوالت بے جا کے حامل مکالمے بھی مصنوعی بن جاتے ہیں۔ مکالموں کے لب و لہجہ کی بے ساختگی ہی ان کو سریع الاثر بناتی ہے۔[1]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مکالموں کی بے تکلفی اور سادگی ہی ان کو پر تاثیر بناتی ہے۔ طویل گفتگو اور آرائش و زیبائش مکالموں کی خوب صورتی کو ختم کر دیتے ہیں۔اس لیے مکالمے میں ثقیل اور نامانوس الفاظ کا استعمال نہیں کیا جانا چاہیے۔ بات چیت کے ذریعے ہی انسان اپنے مافی الضمیر کو بیان کرتا ہے۔ ہر شخص کا دوسرے شخص سے بات کرنے کا انداز اور نوعیت مختلف ہوتی ہے۔مثال کے طور پر ایک تعلیم یافتہ شخص کا ایک ناخواندہ شخص سے بات کرنے کا انداز مختلف ہو گا۔اسی طرح ایک ڈاکٹر اور مریض کے مابین بات کرنے کی نوعیت مختلف ہو گی۔ لہٰذا مکالمہ نگاری

کے فن میں بھی اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ ناول نگار کردار کا مکالمہ اس کی فطرت اور حیثیت کے مطابق ادا کروائے۔ اس حوالے سے احسن فاروقی لکھتے ہیں:

> مکالمہ کو نیچرل صاف اور موزوں ہونا چاہیے، ہر کردار کی بات کا رنگ بالکل جدا ہونا چاہیے کیوں کہ ہم روز کی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ ہر شخص اپنی فطرت کے مطابق بات کرتا ہے اور اپنی بات چیت کا خاص انداز رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی بعض باتوں ہی سے اس کی انفرادی خصوصیات جانچی جاسکتی ہیں۔ ناول کا مکالمہ بھی قدرتی بات چیت ہونا چاہیے یعنی ہر کردار ایسا کلام کرے جو اس کی انفرادیت کو دوسروں کی انفرادیت سے الگ کردے۔[۲]

گویا کسی شخص کے انداز تکلم سے ہی اس شخص کے ذاتی و انفرادی خصائص کو پہچانا جاسکتا ہے۔ سماج میں رہنے والے اشخاص مختلف طبقات سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ان کی آپس میں گفتگو اس انداز سے ہونی چاہیئے جو ان کے ذہنی میلانات کے ساتھ ساتھ ان کی حیثیت اور زبان کی بھی عکاسی کرے۔ لہٰذا مکالمہ نگاری ایک پیچیدہ فن ہے اس میں ناول نگار کو خصوصی احتیاط برتنی پڑتی ہے۔ اسے چاہیئے کہ وہ فطری اور قابل فہم الفاظ کا استعمال کرے لیکن اس بات کو بھی ملحوظ خاطر رکھے کہ اس کی زبان غیر ادبی بھی نہ ہو اور اس کو سمجھنا بھی آسان ہو۔ عظیم الشان صدیقی لکھتے ہیں: "مکالموں میں متکلم کے سن و سال علاقائی اور طبقاتی خصوصیات ماحول اور آپسی رشتوں کا لحاظ بھی رکھنا ضروری ہے تاکہ وہ اپنی زبان کے اعتبار سے ایک دوسرے سے ممتاز نظر آسکیں۔"[۳] مکالمے کسی بھی کردار کے باطن کو سامنے لانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کے ذریعے کسی بھی شخصیت کی خوبیوں اور خامیوں کا پتا لگایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح کرداروں کی حرکات و سکنات کو بھی زبان و بیان سامنے لاتا ہے۔ کسی کردار کی جسمانی حرکات بھی اس کی ذہنی کیفیات کو واضح کرتی ہیں۔ جس سے مکالمے مزید پر اثر ہو جاتا ہے۔ محمد نصر اللہ خان لکھتے ہیں:

> مکالمہ کا شمار دنیا کے قدیم ترین اصناف میں ہوتا ہے، کئی طرز کے مکالموں میں علامتوں اشاروں کنایوں کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔ دراصل اشارے کنائے مکالموں کی زبان کو اور پختگی عطا کرتے ہیں۔ گفتگو کی رفتار میں تیزی لاکر معنوی و فنی خوبیوں کی ایک الگ دنیا بسا دیتے ہیں۔ مکالمے، وقت، حالت اور مخاطب اور سامع کی فکری و فطری، شخصی و جمالیاتی خصوصیات کی بنا پر ہوتے ہیں۔[۴]

اس رائے سے مکالمے کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مکالمے وقت اور حالات کے مطابق مخاطب اور سامع کی فکری بصیرت کے موافق ہونے چاہئیں۔ رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے ضمن میں درج ذیل نکات مکالماتی انداز کے ضمن میں آتے ہیں۔

مثالی آدمی کا خاکہ بناتے ہوئے اس کے مکالماتی انداز کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ مثالی آدمی صبر کرنے والا ہوتا ہے۔ وہ ایک ماڈل ہوتا ہے۔ وہ جس بات کی بھی وضاحت کرتا ہے اسے سمجھنا آسان ہوتا ہے۔ وہ جاذب نظر بھی ہوتا ہے اور ایک قابل قائد بھی۔ اس کی وجہ سے مرد کردار کسی بھی گروپ میں اہم مقام حاصل کر سکتا ہے۔ یہ وہ تذکیری خصائص ہیں جن کو مد نظر رکھتے ہوئے اس باب میں الطاف فاطمہ کے ناولوں کے مرد کرداروں کے مکالماتی انداز تکلم کا جائزہ لیا جائے گا۔

نشان محفل:

سید نادر حسین:

نادر حسین ایک شریف اور ذہین شخص ہے۔ اس نے کالج اور یونی ورسٹی میں بینا کے ساتھ پڑھائی کی۔ اس نے کالج اور یونی ورسٹی میں الیکشن بھی لڑا اور تقریری مقابلوں میں بھی حصہ لیا۔ اس سے اس کی قائدانہ صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ وہ اتنا ذہین اور لائق ہے کہ ادب، آرٹ، فلسفہ، نفسیات، سائنس اور سیاست پر گفتگو کر لیتا۔ روبینا کو اس کے سامنے اپنا آپ بہت حقیر معلوم ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ اس کے سامنے اس طرح کی گفتگو کرتا تو وہ جھنجھلا جاتی۔ روبینا جب نادر کو چھوڑنے کا فیصلہ کرتی ہے تو اس بات پر افسوس کرتی ہے کہ نادر میں کوئی کمزوری نہیں ہے جس سے وہ پیار کرے۔ وہ اس بات کا اعتراف کرتی ہے کہ نادر ایک لائق اور عالی دماغ شخص ہے۔ جب کہ میں تقریباً جاہل ہوں اس لیے مجھ میں اس کے دماغ کی قدر کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ روبینا کے خیالات سے نادر کی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک مہذب شخص ہے۔ وہ مہذبانہ انداز گفتگو اور شائستہ اطوار کا حامل ہے۔ نادر اپنے گھر والوں، دوستوں، ملازموں ہر ایک سے اچھے انداز میں بات کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ تمام لوگ اس کی شخصیت سے متاثر ہوتے ہیں۔ وہ جب اپنے دوستوں یا اپنی بہن رابعہ سے گفتگو کرتا ہے تو مذاق کے سے انداز میں بات کر لیتا ہے یعنی وہ ظریفانہ انداز تکلم اختیار کرتا ہے۔ نادر کا اپنی بہن کو رخصت کرتے ہوئے مکالمہ درج ذیل ہے:

> نادر نے بڑے پیار سے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ ارے پگلی! اب کیا ہر دفعہ اتنا رویا کرے گی ؟ وہ مسکرا رہا تھا۔ مگر اس کا دل اس کے لئے کڑھ رہا تھا۔ دیکھو اب یہ کب آئے اور کیا ہو۔ اس نے پھر پیار سے پوچھا ارے بول ہر بار اتنا ہی رویا کرے گی۔
>
> اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
>
> تب تو بڑی مشکل آئے گی۔ دیہاتی لڑکیوں کی طرح محلے کیا شہر کی آخری سرحدوں تک روں روں کرتی جایا کرے گی۔[۵]

اس اقتباس سے بہن بھائی کی محبت واضح ہوتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نادر ایک نرم دل شخص ہے وہ رشتوں کا لحاظ رکھتا ہے اور اس کے دل میں ان کی قدر ہے۔ اس کے انداز تکلم میں سادگی اور بے ساختگی موجود ہے وہ اپنے مذاق کے سے انداز میں اپنی بہن کو تسلی دے رہا ہے۔ اس کے اقتباس سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ وقت اور حالات کے مطابق گفتگو کرنے کا فن جانتا ہے جو کہ ایک اچھے مکالماتی انداز کی خصوصیت ہے۔ وہ اپنے گھر والوں، ملازموں، شاگردوں اور بیوی سے مہذب انداز میں گفتگو کرتا ہے۔ اس کردار میں کوئی خامی موجود نہیں ہے۔ ایک مرتبہ وہ اپنی بیوی روبینا سے غصے میں بات کرتا ہے جس پر وہ بہت پشیمان ہوتا ہے:

> بکواس نہ کرو۔ پہلی مرتبہ نادر نے اس سے ان الفاظ میں مخاطب ہوا۔
> تم کو کوئی حق نہیں۔ جو مجھے اس طرح کہو۔ وہ بری طرح چلائی۔
> اور تم کو ہر وقت حق ہے کہ مجھے یاد دلاتی رہو کہ میں جنگلی ناشائستہ اور غیر مہذب ہوں۔ اگر یہی بات ہے تو پھر یہ بھی جان لو کہ غیر مہذب اسی لہجہ میں بات کرتے ہیں۔ جس میں آج میں نے تم سے کی ہے۔
> اس وقت اس کا سر چکرا رہا تھا اور کنپٹیاں تپ رہی تھیں۔ اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ ایک عورت سے جو اس کی اپنی بیوی تھی۔ ایسے ناشائستہ اور غیر مہذب طریقہ سے کلام کیا تھا جو اس کے گھرانے کا شیوہ نہ تھا۔[۲]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نادر ایک تہذیب یافتہ گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی تربیت اس انداز میں ہوئی ہے کہ وہ رشتوں کا لحاظ کرتا ہے، عورتوں کا احترام کرتا ہے۔ وہ کبھی بھی برے لہجے یا برے الفاظ میں کسی سے بات نہیں کرتا اس کی وجہ اس کی تربیت ہے۔ جب پہلی مرتبہ اس نے اپنی بیوی سے تلخ انداز میں بات کی تو اس پر بہت شرمندہ ہوا۔ اپنی غلطی پر شرمندہ ہونا اور اس کا اعتراف کرنا اعلیٰ ظرفی کی علامت ہے اور نادر ایک اعلیٰ ظرف انسان ہے۔ رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے مطابق مثالی آدمی جاذب نظر شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔ وہ جس بات کی بھی وضاحت کرتا ہے اسے سمجھنا آسان ہوتا ہے اور وہ اپنی قابلیت کی وجہ سے لوگوں میں اہم مقام اور قابل ستائش جگہ حاصل کرتا ہے۔ نادر کا کردار بھی ایسا ہی ہے وہ جاذب نظر شخصیت کا حامل ہے۔ شخصیت ظاہری اور باطنی صفات کا مجموعہ ہے۔ نادر ظاہری طور پر سانولا مگر دل کش انسان ہے۔ باطنی طور پر بھی نادر میں بہت سی صفات پائی جاتی ہیں وہ لوگوں کی مدد کرتا ہے، خوددار اور مہذب شخص ہے مزید براں اس میں لوگوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت ہے۔ اسی وجہ سے نادر کی شخصیت سے اس کی بیوی روبینا اور ایبک متاثر تھے اور وہ اس کے اعتماد کو اس کے بلند کردار اور شرافت کی وجہ سے ٹھیس پہنچاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ ایبک کے ماموں خانزادہ گل نواز بھی پہلی ہی ملاقات میں نادر کی شخصیت سے متاثر ہوئے اور یہی وجہ ہے کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ایبک اس انسان کو دھوکا دے۔ مجموعی طور

پر دیکھا جائے تو نادر کا کردار تذکیری تھیوری کے مطابق ہے وہ جاذب نظر بھی ہے اس میں دوسروں کو متاثر کرنے کی صلاحیت موجود ہے اور اس کا مکالماتی انداز سادہ اور مہذبانہ ہے۔

ایبک:

ایبک اپنے استاد نادر کے بھروسے کو توڑ کر اس کی بیوی روبینا سے شادی کر لیتا ہے۔ جو انتہائی نامعقول دکھائی دیتا ہے لیکن اس کے اپنے استاد کی عزت کو نقصان پہنچانے میں بھی روبینا کا زیادہ ہاتھ ہے۔ ایبک روبینا کے ساتھ محبت پر دل ہی دل میں شرمندہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کا دل اپنے نیک سیرت اور شریف استاد نادر سے بد دیانتی کرتے ہوئے دکھی ہوتا ہے۔ کئی بار وہ کوشش بھی کرتا ہے کہ یہ گناہ اس سے سرزد نہ ہو مگر محبت کے جوش میں وہ نادر کے ساتھ دغابازی کر گزرتا ہے بعد میں اکثر اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ اس کی زندگی میں جو مشکلات اسے پیش آرہی ہیں وہ اس کے استاد کا صبر اس پر پڑا ہے۔ ایبک کی شخصیت جاذب نظر نہیں ہے کیوں کہ صرف ظاہری خوب صورتی ہی شخصیت کو نہیں نکھارتی جو دوسروں کو متاثر کرے بلکہ انسان کی باطنی صفات و خوبیاں ہی ہیں جو اس کی شخصیت کو لوگوں کے سامنے مؤثر کن بناتی ہے۔ ایبک ظاہری طور پر تو خوب صورت و دلکش ہے مگر اس کی شخصیت میں کوئی خوبیاں نہیں ہیں۔ وہ ایک بے مقصد زندگی بسر کرتا ہے مزید یہ کہ اس کا اخلاق بھی اچھا نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ روبینا سے شادی کرتا ہے تو وہ نادر کی طرح اس کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو نظر انداز نہیں کرتا بلکہ وہ اس کو مارتا پیٹتا ہے اور اسے گالیاں دیتا ہے۔ روبینا کو دکھ پہنچا کر اسے سکون حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح کا متشددانہ رویہ غیر تذکیری ہے۔ وہ پٹھانوں سے مختلف ہے۔ اس کو اشتعال انگیزی سے نفرت ہے مگر شادی کے بعد جس طرح کا رویہ سامنے آتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اکھڑ پن اسے وراثت میں ملا ہے کیوں کہ پٹھان غصے کے تیز ہوتے ہیں:

> الو کی پٹھی بھنگنوں کی شکل بنائے رکھتی ہے، مجھے بدنام کرتی ہے۔ وہ اس کو گالیاں دیتا اور جواباً وہ دل بھر کر لڑتی اور بدزبانی کرتی۔ آخر میں وہ اٹھ کر اس کی اچھی طرح مرمت کر دیتا اور پھر بیٹھ کر اس سے معافیاں مانگتا۔۔۔ اور دوسرے کی زندگی تلخ بناتے جارہے تھے۔ وہ اس کو انگریزی میں باتیں سناتی تو وہ اس کو ترکی بہ ترکی جواب دیتا مگر جب پشتو میں اس کے فضیحتے کرتا تو وہ بگڑ جاتی۔
>
> پشتو میں گالیاں بک رہے ہو، انگریزی یا اردو میں بولو۔
>
> اردو میرے باپ کی زبان ہے نہ تیرے باپ کی۔ وہ اردو میں ہی کہتا۔۔۔
>
> خبردار جو زبان چلائی ہے ورنہ۔۔ وہ جلی جلدی شیو کے لیے صابن مل رہا تھا۔

غنیمت ہے کہ اس کے ہاتھ میں قینچی ہی آگئی، وہی کھینچ کر ماردی۔ قینچی کی نوکیں کلائی میں گھس گئیں اور بھل بھل خون بہنے لگا۔۔۔اس کے چہرے کی اذیت ناک کیفیت اس کو اور بھی پیاری لگی وہ اس کو دکھ پہنچا کر ہمیشہ خوش ہوتا تھا۔[۷]

اس اقتباس سے ایبک کے مکالماتی انداز اور اس کے مزاج کے بارے میں پتا چلتا ہے کہ وہ ایک بد تہذیب اور ناشائستہ قسم کا انسان ہے۔ وہ پڑھا لکھا ہونے کے باوجود بھی غیر مہذب زندگی گزار رہا ہے۔ اسے بات کرنے کا سلیقہ نہیں ہے بلکہ بد تمیزی سے بات کرتا ہے اور گالیاں دیتا ہے۔ عورت کے ساتھ اس طرح کا رویہ ثابت کرتا ہے کہ وہ غیر تذکیری کردار ہے۔ اس میں وحشیانہ پن موجود ہے جو کسی کو بھی متاثر نہیں کر سکتا۔ وہ تشدد کے رویے کو اپناتا ہے اگرچہ بہت سے معاشروں میں تشدد اور جارحیت کو تذکیری خصائص سمجھا جاتا ہے۔ مگر رابرٹ ووڈ نے اپنی تذکیری تھیوری میں تشدد کے رویے اپنانے والے کو وولن اور غیر تذکیری کردار قرار دیا ہے جب کہ وہ مرد جو تشدد کو روکتا ہے اور بھلائی کو فروغ دیتا ہے وہ ہیرو اور تذکیری کردار ہے۔ درج بالا مکالمہ ایبک کے رویے کو ظاہر کرتا ہے جو غیر تذکیری ہے اور اس کا مکالماتی انداز بھی درشت اور غیر مہذب ہے جو کسی کو بھی متاثر نہیں کر سکتا۔

محمود:

محمود نے اپنے بچپن کا کچھ عرصہ بہت لاڈ پیار سے گزارا۔ مگر حالات کی ستم ظریفی نے اس کو تمام رشتوں سے دور کر دیا۔ اس کی ماں کے طلاق لینے کے بعد اس نے ہاسٹل کی زندگی گزاری۔ جب وہ ہاسٹل میں تھا تو اسی دور میں اس کے والد نادر کا انتقال ہو گیا۔ اس کی ماں نے کبھی اس سے نہ رابطہ کیا نہ خط لکھا۔ غرض وہ ماں باپ کی محبت سے محرومی کی زندگی بسر کرتا رہا۔ جس نے اسے صابر شخص بنا دیا۔ اس نے ہجرت کے موقع پر فسادات دیکھے۔ جب وہ لاہور اپنی ماں کے پاس پہنچا تو اسے وہاں اس کے سوتیلے بہن بھائی ملے۔ اس نے اس پر صبر کیا اور خاموشی اختیار کی۔ ایبک جو اسے بچپن میں بہت پیار کرتا تھا اور کہانیاں سناتا تھا۔ محمود نے اس کی سختیاں برداشت کیں۔ غرض ہر طرح کے مشکل حالات میں صبر کیا۔ رابرٹ ووڈ اپنی تھیوری میں مکالماتی انداز کے ضمن میں صبر کو بھی ایک تذکیری خصوصیت بتاتا ہے محمود کے کردار میں یہ خصوصیت موجود ہے۔ وہ بہت حلیم اور صابر طبع واقع ہوا۔ ایبک جب محمود کو شملہ سے واپس آنے کے بعد دیکھتا ہے تو اس کو ناول میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

محمود یکلخت بڑھ گیا تھا۔ اب وہ تقریباً برابر ہی کا نظر آنے لگا تھا۔ اس کا چہرہ پتلا اور خشک تھا۔ جسم لاغر لیکن اس کی ساخت مضبوط تھی۔ اور بہت اچھا قد نکال رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ہمیشہ سوچتی ہوئی اور شرمائی سی تھیں۔ بوسیدہ پتلون اور گھسے ہوئے جوتے میں بھی قابل توجہ نظر آرہا تھا۔[۸]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جسمانی قابلیت کا حامل شخص ہے۔ اس کے برعکس ایبک کو اپنا بیٹا ہمایوں تندرست مگر بد تمیز اور بد زبان معلوم ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محمود کی شخصیت سے متاثر ہے اسے اس

بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ نادر حسین کا خون ہے شاید اسی وجہ سے اس حالات میں بھی وہ مہذب طریقے سے رہتا اور بات کرتا ہے۔ محمود کے مکالماتی انداز تکلم کے حوالے سے دیکھا جائے تو وہ خاموش طبع شخص ہے کسی سے زیادہ بات چیت پسند نہیں کرتا بلکہ لیے دیے رہتا ہے۔ مکالماتی انداز کے حوالے سے پھوپھی سے ملاقات کے وقت محمود اور اس کی پھوپھی رابعہ کا مکالمہ درج ذیل ہے:

> اے ہے کس قدر پیارا ہے یہ بچہ اور اس کی آنکھیں تو خصوصیت سے کیسی پیاری ہیں۔ ان کے کیے ہوئے سوالوں کے جواب اس نے ایک بڑی مہذب رکھائی اور اختصار سے دیئے۔ اس کی پیشانی اور بالوں کے انداز میں اس کو مغربی خون کی جھلک سی نظر آئی۔ بعض وقت مغرب اور مشرق کا خون مل کر کتنا خوب صورت امتزاج پیدا کرتا ہے۔ وہ سوچ رہی تھیں۔
> کھانے کے وقت وہ انہی کے قریب تھا۔ دوسرے لڑکوں کی بہ نسبت زیادہ مشاقی سے کھانا کھا رہا تھا۔ اس کی انگریزی باوجود زبان کی لکنت کے زیادہ بے تکلف اور منجھی ہوئی تھی۔[9]

رابعہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اس کے بھائی کا بیٹا محمود ہے۔ وہ اس سے بہت متاثر ہوئی۔ اس اقتباس سے محمود کا مکالماتی انداز بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ ایبک کے ساتھ رہتے ہوئے بھی غیر مہذب انسان نہیں بنتا بلکہ نادر کا بیٹا ہونے کا ثبوت دیتا ہے اور مہذب انداز میں گفتگو کرتا ہے۔ وہ انگریزی زبان پر دسترس رکھتا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی ماں انگریز ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو محمود کا کردار متاثر کن ہے اور اس میں تذکیری صفات موجود ہیں۔

خانزادہ گل نواز:

خانزادہ گل نواز ایک وجیہہ اور تندرست شخص ہے۔ ان کا کاروبار اعلیٰ نسل کے کتوں کو پال کر ان کو بیچنا ہے۔ وہ ان کتوں کی دیکھ بھال بڑے منہمک ہو کر کرتے ہیں۔ وہ بے فکری کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور ایک خوب صورت کاٹیج میں بڑی شان سے رہتے ہیں۔ ان کی بات کرنے کا انداز سادہ اور عام فہم ہے۔ وہ معلومات سے بھرپور گفتگو کرتے ہیں۔ ان کی شخصیت متاثر کُن ہے۔ ان کی شخصیت اور مکالماتی انداز کے حوالے سے ناول میں الطاف فاطمہ لکھتی ہیں:

> خانزادہ گل نواز بہت دلچسپ اور مہمان نواز ثابت ہوئے۔ وہ بڑے پر لطف انداز میں بات کرتے تھے۔ اس کی باتوں کا انداز دلچسپ دھیما اور معلومات سے پُر ہوتا تھا۔ مگر ان کی گفتگو میں کسی قسم کی تعلّی یا مبالغہ آمیزی نہ تھی۔ روبینا اور نادر دونوں اپنی اپنی جگہ ان سے متاثر تھے۔[10]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خانزادہ گل نواز میں لوگوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت موجود ہے جو رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے مطابق ہے۔ مزید خانزادہ گل نواز کی معلوماتی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی بڑائی

جتانے یا پھر مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیتے اور یہ ان کی شخصیت کی خصوصیت ہے یہی وجہ ہے کہ لوگ ان سے متاثر ہوتے ہیں۔ خانزادہ گل نواز معاملہ فہم شخص ہیں وہ ایبک کو جس انداز میں سمجھاتے ہیں وہ بھی متاثر کُن ہے:

> اتنا ضرور جان رہا ہوں کہ اس معاملے میں تمہارے جذبات میں شدت ضرور آچکی ہے اور تم اس کو وقتی طور پر دیوانہ نہیں بنا رہے ہو۔ بلکہ واقعی اس سے محبت کرتے ہو۔ لیکن ایبک اس مساوی دنیا میں کسی سے واقعی محبت کرتے رہنے سے کام بنتا نہیں، بلکہ بگڑ ہی جاتا ہے۔ خصوصاً ایک شادی شدہ عورت سے اتنی بے تابی سے محبت کچھ اچھے نتائج نہیں پیدا کرتی۔ ایسی صورت میں یکسوئی بہتر ہوتی ہے۔[11]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خانزادہ ایک سمجھ دار اور حقیقت پسند انسان ہے۔ وہ زندگی کی حقیقتوں سے بخوبی واقف ہیں اور نتائج کا سوچ کر قدم اٹھاتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ محض محبت کے ساتھ زندگی نہیں گزرتی اسی لیے اسے الگ ہو جانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ وہ نہایت سادہ اور عام بول چال کی زبان میں ایبک کو زندگی کی حقیقتوں سے آگاہ کرتے ہیں اور اسے اس راہ پر چلنے سے منع کرتے ہیں۔ ان کے مکالماتی انداز سے قاری بھی متاثر ہوتا ہے۔ ان کا انداز گفتگو سادہ مگر بامعنی اور اثر انگیز ہے۔

اویناش:

اویناش ایک ذہین اور صاف گو انسان ہے۔ اس نے بھی نادر کے ساتھ تعلیم حاصل کی اور ادب، فلسفہ اور آرٹ میں دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ شاعری میں بھی دلچسپی رکھتا ہے اس لیے اپنی گفتگو میں شعر کی ادائیگی بھی کرتا ہے۔ ناول میں وہ ایک خط کے ذریعے منظر پر آیا۔ جس کا آغاز اس نے شعر سے کیا:

> مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
> جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے[12]

اس سے اویناش کے شعری ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے دوستوں سے محبت کرتا ہے اور ان کا ہر طرح سے خیال رکھتا ہے۔ اس کا انداز تکلم ظریفانہ ہے وہ سب سے مذاق کرتا ہے۔ روبینا کو بھابھی کہہ کر بلاتا ہے اور اس پر حکم بھی چلاتا ہے۔ اس سے فصیح بلیغ اردو میں بات کرتا ہے جس پر نادر اسے کہتا ہے کہ تم اس سے اس انداز میں بات نہ کرو وہ لکھنؤ یا دہلی سے تعلق نہیں رکھتی جس پر وہ کہتا ہے کہ وہ لکھنؤ کی بہو تو ہے ناں۔ روبینا اس کی بات کرنے کے انداز سے بہت متاثر ہوئی وہ اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کروانا چاہتی ہے۔ وہ جب خاموش ہوتا ہے تو وہ بے چین ہوتی ہے کہ وہ کوئی بات کرے۔ اویناش بات کرتے ہوئے ہندی کے الفاظ بھی استعمال کرتا ہے جس سے اس کی تہذیب کی نمائندگی بھی ہوتی ہے۔ یہی مکالمے کی خوبی ہے کہ وہ شخصیت اور تہذیب کی نمائندگی کرے چوں کہ مکالمے کی زبان کا فطری ہونا ضروری ہے اس میں تصنع اور بناوٹ نہیں ہونی چاہیئے اویناش کا مکالماتی انداز تکلم بھی ایسا

ہی ہے۔ وہ روبینا کو کہتا ہے: "بھگوان دیا کریں گے، کشل رہو گی۔"[۱۳] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عام بول چال کی زبان میں گفتگو کرتا ہے اس کے انداز میں بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ اس کے انداز تکلم کے حوالے سے تسنیم آصف لکھتی ہیں:

> نادر کے دوست اویناش کی شخصیت بھی اپنے اندر جاذبیت رکھتی ہے۔ قاری کو بھی اویناش کی حس مزاح بہت متاثر کرتی ہے۔ اس کی دلچسپ طبیعت نے روبینا کو بہت متاثر کیا۔ مگر مذاق کرتے کرتے کہیں وہ بہت سنجیدگی اور پتے کی باتیں بھی کر دیتا۔[۱۴]

اویناش کا کردار رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے اس پہلو پر پورا اترتا ہے کہ اس میں لوگوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت ہے۔

دستک نہ دو:

صفدر یاسین:

صفدر یاسین اپنی معاشی تنگ دستی کی بدولت اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکا۔ وہ تلاش معاش کے سلسلے میں ہندوستان آگیا۔ مگر وہ مطالعے کا شوقین ہے۔ وہ فارغ اوقات میں مصوری کے ساتھ ساتھ کتب بینی بھی کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کا انداز تخاطب مؤثر کُن ہے۔ لاؤنڑے کا پیروکار ہونے کے باعث اس کے اقوال پر عمل کرتا ہے۔ الطاف فاطمہ نے اس کردار کے ذریعے چینی شاعری کو بھی ناول میں بیان کیا ہے۔ صفدر یاسین حساس دل کا مالک ہے وہ دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہوتا ہے اور انھیں بہترین مشورے دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ معمولی سا پھیری والا ہونے کے باوجود اپنی باتوں سے دوسروں کو متاثر کرتا ہے۔ گیتی، شہریار اور صولت آرا تمام لوگ اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ یہ تذکیری خصوصیت ہے۔ صفدر یاسین صولت آرا کے جہیز کے سلسلے میں چینی دستکاریاں لے کر جہانگیر مرزا کے گھر جاتا ہے جہاں وہ صولت کو دیکھتے ہی اس حقیقت سے آشنا ہو جاتا ہے کہ صولت اس شادی سے ناخوش ہے۔ اس حوالے سے صفدر یاسین جس انداز سے صولت کو سمجھاتا ہے وہ برجستہ اور متاثر کن ہے۔ اس سے صولت کو ہمت و حوصلہ ملتا ہے۔ صولت اور صفدر یاسین کے مابین ہونے والے مکالمے کے متعلق صولت سوچتی ہے:

> اس دن مجھ سے کہنے لگا۔ تم اس چیانگ کائی شک سے کاہے کو شادی کر رہی ہو؟
> اور کل جب وہ دوبارہ کمونو دینے آیا تو کس طرح مجھے اکیلا بیٹھے دیکھ کر برآمدے میں آیا اور بے حد عاجزی اور ملائمت سے کمونو ٹرائی کرنے کو کہہ کر خود اطمینان سے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اور جب میں نے کمونو اتار کر میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں یہ بالکل ٹھیک ہے، تو اس نے اس کو بڑی

خوب صورتی سے تہہ کر کے میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا، خدا مبارک کرے اور تم اس کو خوشی سے استعمال کرو۔" اور پھر نہ جانے کیوں میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

یہ واقعہ ہے کہ اس دلچسپ اور نو عمر چینی لڑکے نے کچھ اتنے خلوص اور سادگی سے یہ لفظ کہے تھے کہ صولت کی خوب صورت آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئی تھیں۔۔۔۔۔

وہ چینی لڑکا بغیر کسی تمہید کے بولا "تم آج بھی افسردہ ہو اور اس دن اپنے منگیتر کے سامنے بھی بیزار تھیں۔ تم اپنی اس شادی سے ناخوش ہو نا۔"

اگر کوئی اور وقت اور کوئی دوسرا شخص ہوتا تو وہ ایک ٹھوکر مار کر سامنے رکھی ہوئی میز کو گراتی ہوئی برآمدے کے دوسرے سرے پر جا کر پوری طاقت سے کہتی۔ نکل جاؤ! ابھی میرے سامنے۔

مگر یہ وقت کچھ اور تھا اور یہ الفاظ کہنے والا شخص بھی کچھ اور قسم کا تھا۔ اس کی نیت میں کھوٹ نہ تھی۔ وہ اس کا مذاق اڑانے اور اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہونے کے لیے بات نہ کہہ رہا تھا۔ اس کی آواز میں خلوص تھا اور لہجے میں سادگی۔

اس لیے صولت جہانگیر نے جس کا دل پکار پکار کر اعلان کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس شادی سے ناخوش ہے، بڑی خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اور وہ اس کی اجازت کے بغیر ہی اس کے قریب اپنے گٹھر پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔

تو مس! کیا اس معاملے میں تم اپنی رائے نہیں دے سکتیں؟ وہ اچھی خاصی انگریزی بول لیتا تھا۔

یہی سمجھ لو۔

تب تو تمہیں رنجیدہ ہونے کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔

کیوں؟

تمہیں معلوم ہے جس چیز میں ہماری رائے اور مرضی کو دخل نہ ہو وہ نوشتہء تقدیر کہلاتی ہے۔[۱۵]

وہ صولت کو چینی لہجے میں ایک نظم سناتا ہے۔ جس سے صولت مطمئن ہوتی ہے اور زبیر کی تصویر کو اپنے کمرے سے ہٹا دیتی ہے۔ رابرٹ ووڈ کی تھیوری کے مطابق مثالی آدمی جس بات کی بھی وضاحت کرتا ہے اسے سمجھنا آسان ہوتا ہے اور وہ اپنے انداز تکلم اور اپنی صلاحیت کی وجہ سے لوگوں میں قابل ستائش جگہ حاصل کرتا ہے۔ درج بالا مکالمے سے ظاہر ہوتا ہے کہ صفدر یاسین کا کردار بھی ایسا ہی ہے۔ وہ دوسرے لوگوں کے لیے ہمدردی کے جذبات رکھتا ہے اور دوسروں کے غم میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔ اس کا انداز گفتگو انتہائی بے باکانہ ہے مگر اس کی نیت میں کسی قسم کا کھوٹ نہیں ہے۔ وہ مخلصانہ اور ہمدردانہ انداز میں صولت کو سمجھاتا ہے۔ اس سے قبل صولت کو کسی دوسرے شخص نے سمجھانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ صفدر یاسین اسے سمجھاتا ہے تو اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوتی ہے۔ صولت انتہائی مغرور اور رکھ رکھاؤ والی لڑکی ہے وہ نچلے طبقے کے لوگوں کے ساتھ بیٹھنا اور بات کرنا پسند

نہیں کرتی مگر صفدر یاسین کی اثر انگیز گفتگو سے متاثر ہو کر وہ اس کے سامنے اپنا دل کھول بیٹھتی اور اس کی باتوں سے مطمئن بھی ہو جاتی ہے۔ اپنی شادی کو تقدیر کا لکھا مان کر اس پر صبر کر لیتی ہے۔ چوں کہ مکالمے کے ذریعے انسان اپنے خیالات اور اپنی سوچ کو دوسروں تک پہنچاتا ہے اور دوسرا شخص اپنے فہم کے مطابق اس سے اثر قبول کرتا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو صفدر یاسین کا مکالماتی انداز پر تاثیر ہے۔ یہ شخص اپنی جسمانی حرکات اور مکالماتی انداز سے اپنے پیشے، حیثیت اور تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے۔

جہانگیر مرزا:

جہانگیر مرزا اپنے علاقے کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ ان کا رہن سہن اور رکھ رکھاؤ اعلیٰ افسروں کا سا ہے۔ انھیں فلسفہ اور دین سے بہت لگاؤ ہے۔ وہ مطالعہ کے شوقین ہیں اور حقہ پیتے ہوئے "مثنوی مولانا روم" کو نہایت اشتیاق سے پڑھتے ہیں۔ جہانگیر مرزا نے اپنی اولاد کی تربیت کی ذمہ داری مکمل طور پر ان کی والدہ کے سپرد کر رکھی ہے۔ مگر انھیں اس بات کا احساس ہے کہ ان کی چھوٹی بیٹی گیتی احساس کمتری میں مبتلا ہے۔ اس لیے وہ گیتی کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے اس سے کہتے ہیں کہ تم میری اولاد میں سب سے زیادہ خوب صورت ہو۔ وہ یہ کہہ کر گیتی کو اس نفسیاتی کشمکش سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ الطاف فاطمہ نے جہانگیر مرزا اور گیتی کے مکالمے کے ذریعے باپ اور بیٹی کی محبت کو نہایت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ گیتی جب لاہور کالج میں داخلے کا ارادہ کرتی ہے اور اپنے والد سے اس حوالے سے گفتگو کرتی ہے تو وہ اس کے ساتھ نہایت شفقت و محبت سے بات کرتے ہیں کہ وہ یہاں سے کیوں جانا چاہتی ہے۔ ان کا مکالمہ درج ذیل ہے:

> طلعت سے میری کوئی لڑائی نہیں ابا میاں! لیکن کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا کوئی سبب نہ ہونے کے باوجود ان کا کرنا ہمیں پسند نہیں ہوتا۔
>
> انھوں نے غور سے اپنی لڑکی کی طرف دیکھا جس کے ساتھ ہی پیدا ہونے والی دوسری بیٹی یعنی ارجمند۔ اس سے عمر اور تجربے میں کہیں زیادہ چھوٹی معلوم ہوتی تھی۔ وہ اس وقت بہت سنجیدہ اور بہت بڑی عمر کی نظر آ رہی تھی۔ اس کے تیور اس کے ارادے کی پختگی کی غمازی کر رہے تھے۔ انھوں نے ایک گہری سانس لی۔ وہ ہمیشہ یہ محسوس کرتے تھے کہ ان کی بیٹی کے ساتھ اس گھر میں کبھی انصاف نہیں کیا گیا۔ اچھا بیٹی! تو پھر یوں کرتے ہیں کہ تم کو لاہور کے کنیرڈ کالج میں داخلہ دلوا دیتے ہیں۔ اب تم بے فکر ہو جاؤ۔[۱۶]

درج بالا مکالمے سے جہانگیر مرزا کے انداز تکلم واضح ہوتا ہے جو انتہائی مشفقانہ ہے۔ جہانگیر مرزا پہلی مرتبہ اپنی اولاد اور ان کی والدہ کے درمیان آئے۔ زندگی کے وسیع تجربات اور گہرے مشاہدے کی وجہ سے انھیں احساس ہوا کہ گیتی اس کی ماں کے لیے ناقابل فہم ہے۔ اس لیے وہ سوچتے ہیں کہ انھیں گیتی کے معاملات میں دلچسپی لینی

پڑے گی۔ جہانگیر مرزا کا مکالماتی انداز اور جسمانی حرکات ان کے طبقے اور حیثیت کی غمازی کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ ذاتی و جذباتی مطابقت رکھتے ہیں۔ ان کی جسمانی حرکات ان کے مکالماتی انداز کو پر تاثیر بناتے ہیں۔ جیسا کہ تذکیری تھیوری میں بیان کیا گیا ہے کہ مثالی آدمی جو بات بھی کرتا ہے وہ قابل فہم ہوتی ہے اور وہ جاذب نظر بھی ہوتا ہے۔ جہانگیر مرزا کی شخصیت میں یہ دونوں خصائص موجود ہیں۔ ان کا سادہ انداز گفتگو، نرم لہجہ اور شخصیت کی جاذبیت دوسروں کو متاثر کرتی ہے۔ جہانگیر مرزا کم گو انسان ہیں۔ وہ کبھی کبھار اپنے مالی سے پودوں کے متعلق گفتگو کر لیا کرتے ہیں۔ ان کا انداز تکلم اپنے ملازمین کے ساتھ بھی مشفقانہ ہے۔ اس سے ان کے حسن اخلاق کا اندازہ ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو جہانگیر مرزا دیگر کرداروں جن میں ان کی بیوی، بچے، بھابھی اور دیگر رشتہ دار اور ملازمین شامل ہیں۔ ان کے ساتھ محبت و شفقت بھرے لہجے میں گفتگو کرتے ہیں۔ ان کی شخصیت ظاہری اور باطنی طور پر متاثر کن اور اثر انگیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب صفدر یاسین نے انھیں پہلی مرتبہ دیکھا تو وہ ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔ وہ یہ سوچنے لگا کہ اس شخص کا تعلق مغلیہ خاندان سے ہو سکتا ہے۔ اس سے ان کی شخصیت کی جاذبیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ رابرٹ ووڈ مکالماتی انداز کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ تذکیری کردار جاذب نظر اور دوسروں کو متاثر کرنے والا ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ تذکیری کردار ہے۔

بختیار:

بختیار بچپن میں شرارتی طبیعت کا مالک تھا جب کبھی اپنی زمینوں یعنی عالم پور بستی جاتا تو وہاں لگی ہوئی مورتیوں کو لے بھاگتا پھر جہانگیر مرزا خود لا کر اس سے وہ مورتیاں اس کی جگہ پر رکھواتے۔ علاوہ ازیں وہ اپنے ملازمین سے بے تکلفی سے گفتگو کرتا ان کی زبان میں گنتی سیکھتا مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت میں تبدیلی آگئی اور وہ ہنس مکھ لڑکے سے ایک سنجیدہ مزاج شخص بن گیا۔ یہاں اس کردار کے ارتقائی سفر کو بیان کیا گیا ہے کہ یہ کردار جامد نہیں ہے بلکہ اس میں وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو تبدیل کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ وہ ایک غیر ذمہ دار شخص سے ایک ذمہ دار شخص بن گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ والد کی وفات اور بھائی کی عدم موجودگی میں تمام ذمہ داریاں اسے ادا کرنی ہیں۔ وہ جب والد کی وفات کے بعد اپنی بستی گیا تو اس کے مزاج میں واضح تبدیلی آگئی۔ وہ اپنے ملازم اکرام سے اب پہلے کی طرح بے تکلفی سے گفتگو نہیں کر سکتا کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ ان کے مابین حفظ مراتب کی دیوار حائل ہے اور ملازموں سے اس قدر بے ساختگی سے ہم کلام ہونا اس کی تہذیب کے خلاف ہے۔ اس لیے وہ اپنے ملازموں سے سنجیدہ انداز میں کلام کرتا مگر اس کے لب و لہجے میں نرمی پائی جاتی۔ مزید یہ کہ جب وہ مدنیا پور آیا تو وہ نہ تو اپنے ساتھ ملازم لایا اور نہ پیچوان۔ اسے دیکھ کر منشی کو حیرت ہوئی کہ بڑے صاحب تو اس طرح نہیں آتے تھے۔ جب کہ اس کے موجودہ مالک میں وہ رعب و جلال نہیں پایا جاتا۔

بختیار کی قائدانہ صلاحیتوں کے حوالے سے دیکھا جائے تو بختیار کا کردار ایسا ہے جس نے بڑے بھائی کی غیر موجودگی اور باپ جیسے قیمتی اثاثے کو کھونے کے بعد اس پر صبر کیا۔ اگرچہ وہ باطنی طور پر بہت افسردہ ہے مگر ظاہری طور پر اس نے اپنی افسردگی کا اظہار نہیں کیا۔ اس نے اپنی ذمہ داریوں کو سمجھا اور ان پر توجہ دی۔ اس نے زمینوں کے تمام کاغذات، بینکوں کے تمام معاملات دیکھے اس کے بعد وہ اپنی زمینوں کی نگرانی کی خاطر خود عالم پور بستی گیا تاکہ زمینوں اور اناج وغیرہ کو دیکھ کر ان کا حساب کتاب کر سکے۔ قائدانہ صلاحیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ محض کام کو اپنے ماتحتوں کو نہ سونپ دیا جائے بلکہ اس کی نگرانی خود کی جائے۔ کیوں کہ اگر انسان کام صرف ماتحتوں کو سونپ کر اس سے بری الذمہ ہو جائے تو معاملات احسن طریقے سے انجام نہیں پاتے۔ بختیار نے اپنی ذمہ داریوں کو سمجھا اور خود اس کی نگرانی کی اس تناظر میں دیکھا جائے تو بختیار میں بہتر سربراہانہ صلاحیت پائی جاتی ہے۔ رابرٹ ووڈ نے مکالماتی انداز کے ضمن میں قائدانہ صلاحیت کو بھی تذکیری خصوصیت بیان کیا ہے تو بختیار کے کردار میں یہ خصوصیت موجود ہے۔

بختیار ایک پڑھا لکھا نوجوان ہے۔ اس کے انداز تخاطب میں نرمی اور حساسیت موجود ہے۔ وہ معاملہ فہم ہے اور جانتا ہے کہ کس شخص سے کس انداز میں بات کر کے اس کو مطمئن کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی مشفقانہ گفتگو اور نرم لہجے کے ذریعے گیتی جیسی لاابالی اور ضدی لڑکی کو ہمت و حوصلہ دیتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ گیتی کو غصے کے بجائے پیار و محبت سے سمجھایا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گیتی بھی اپنے بھائی کی باتوں کو سمجھتی ہے اور صفدر سے ملنا چھوڑ دیتی ہے اور اس کی طبیعت میں ٹھہراؤ آ جاتا ہے اور وہ ایسی حرکتوں سے باز آ جاتی ہے جن سے اس کی ماں پریشان ہوتی ہے۔ گیتی اور بختیار کے درمیان ہونے والے مکالمے کے ذریعے بختیار کے مکالماتی انداز کی وضاحت ہوتی ہے:

بختیار نے بدقت کہنا شروع کیا:

> حالات بہت بدل گئے ہیں اور میں تم سے کیا کہوں۔ اب ہم تم عمر کی اس منزل میں ہیں جب ہمیں ہر حقیقت کے مقابلے اور برداشت کی تاب ہونا چاہیئے۔ اب بڑے بھیا کبھی واپس نہ آئیں گے۔ گم شدوں کی فہرست میں نہیں بلکہ مرنے والوں کی فہرست میں ان کا نام ہے۔ ہم نے اماں سے یہ خبر چھپالی ہے اور یہ بھی ہماری غلطی ہے' لیکن پھر بھی جنگ کے سلسلے میں ایسی خبریں عرصے تک چھپی رہ سکتی ہیں۔
>
> گیتی کو چکر سا آ گیا۔ مگر بظاہر وہ سوکھی آنکھوں کھڑی رہی۔ اس کے بھائی نے اس کے سفید ہوتے ہوئے چہرے کو دیکھا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔
>
> تم تو بڑی بہادر لڑکی ہو۔ تم خدا سے میرے لیے دعا کیا کرو۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ سب کے حصے کی ذمہ داریاں مجھ ہی کو نبھانا پڑ جائیں گی۔ اور دیکھو' اب تم کسی وقت بھی ہراساں

نہ ہونا۔ تم کو جو الجھن ہو مجھ سے کہو۔ گیتی! تم کو اباں میاں سے بڑی محبت تھی۔ تمھیں یاد نہیں
'وہ مخالفت اور اپنے مزاج کے خلاف باتوں کا کس سکون اور استقلال سے مقابلہ کیا کرتے تھے۔
پھر وہ رکا۔ اس نے گیتی کی طرف دیکھا اور بولا:
یہ بھی ایک بڑی اچھی بات ہے کہ لوگوں میں ہمدردی اور دوسروں کو سہارا دینے کا جذبہ موجود ہے۔ لیکن میں یہ کچھ اچھا نہیں سمجھتا کہ انسان میں دوسروں سے ہمدردی وصول کرنے اور ان کا سہارا لینے کا جذبہ موجود ہو۔
پھر اس نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا" خدا حافظ۔[۱۷]

درج بالا مکالمہ بختیار کے انداز تکلم کی وضاحت کرتا ہے کہ وہ ایک تعلیم یافتہ شخص ہے۔ وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو تسلیم کرتا ہے۔ اس سے میں خودداری کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور وہ گیتی کو بھی خودداری کا درس دیتا ہے۔ گیتی کے شانے پر ہاتھ رکھنے کے انداز سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنی بہن کی دلی کیفیات کو سمجھتا ہے اور اسے ہمت و حوصلہ دیتا ہے۔ گیتی کے لیے اس کی گفتگو قابل فہم ہے۔ اس کا نرم لہجہ اور شگفتہ انداز گیتی کی شخصیت میں مثبت تبدیلی لاتے ہیں۔ بختیار کا مکالمہ اس کی شخصیت سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس کے الفاظ اس کے جذبات سے ہم آہنگ ہیں۔ لہذا مندرجہ بالا تناظر میں دیکھا جائے تو بختیار کا کردار رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے مطابق ہے۔ کیوں کہ اس میں صبر، قائدانہ صلاحیت جیسے تذکری خصائص موجود ہیں۔ مزید براں یہ اپنے انداز گفتگو کے ذریعے سب کو متاثر کرتا ہے یہی سبب ہے کہ اس کے ملازمین، رشتہ دار اور اس کی بہنیں اس سے محبت کرتی ہیں۔ اس کی شخصیت ان تمام لوگوں کے لیے مؤثر کن ہے۔

کرنل سجاد:

کرنل سجاد پر کشش اور ذہین کردار ہے۔ انٹیلی جنس سروس میں ہونے کی وجہ سے اس نے دنیا دیکھ رکھی ہے۔ اس لیے وہ لوگوں کے رویے اور شخصیت کو بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے۔ وہ دور اندیش ہے۔ اس کی شخصیت میں دو خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ جھوٹ نہیں بولتا دوسرا اس کا ذہن روشن ہے۔ وہ ہر شخص کے ساتھ اس کی سطح پر آکر بات کرنے کا فن جانتا ہے۔ وہ بچوں کے ساتھ بچہ اور بڑوں کے ساتھ بڑا بن کر پیش آتا ہے۔ اس کا انداز گفتگو دلچسپ ہے۔ گیتی سے محبت کے جذبات کو وہ ایک عرصے تک اپنے دل میں چھپائے رکھتا ہے اور اس کا اظہار نہیں کرتا یہ ایک تذکیری رویہ ہے کہ مرد اپنے جذبات پر قابو رکھتا ہے۔ مگر قیام پاکستان کے بعد جب سجاد کی گیتی سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ اس سے اظہار محبت کرتا ہے اور شادی کے لیے کہتا ہے۔ اس حوالے سے ان کا مکالمہ درج ذیل ہے:

اس لیے کہ مجھے تم سے محبت ہے اور اب سے نہیں۔ اس وقت سے جب میں تمھارا ہاتھ ادھورا
چھوڑ کر یکایک غائب ہو گیا تھا۔ اب مل گیا نہ اس دن کے سوال کا جواب؟

وہ اس شخص کے یوں بے دھڑک کہہ دینے سے کہ "مجھے تم سے محبت ہے" سٹ پٹا سی گئی۔
مگر میرا تو خیال تھا کہ آپ۔۔۔وہ رکی۔
صولت آپا سے محبت کرتے ہیں۔ سجاد نے جملہ پورا کر دیا۔
ہاں! یہی میرا بھی خیال تھا اور میں اس کی محبت میں بہت بے تاب اور پریشان بھی تھا، مگر۔۔۔ پھر اچانک ہی مجھے یہ احساس ہوا کہ میری حالت اس شخص کی ہے جو کسی سے ملنے یا بات کرنے کے انتظار میں وقت گزاری کے لیے کوئی کتاب پڑھنا شروع کر دے۔
محبت ہے تو پھر یہاں لانے کا کیا مطلب؟ اب پھر اس کی آواز میں خوف کی آمیزش تھی۔
مطلب یہ ہے کہ میں یہاں زیادہ سکون سے تم سے بات کر سکتا تھا۔ اب تم مجھے سوچ کر جواب دو۔
کیا جواب دوں؟ یہی کہ مجھ سے شادی کرنے کے متعلق کیا خیال ہے؟
کیا خیال ہے؟ اس نے دہرایا۔ اچانک اسے برسوں پہلے کی بات یاد آ گئی۔ اس نے ایک دن اسی بے تکلفی اور بے باکی سے اپنے باغ کے کنویں کی جگت پر بیٹھ کر مسعود سے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا اور اس سے جواب مانگا تھا۔
کیا سوچ رہی ہو، لڑکی؟ وہ اس کی طرف جھکا اور بڑے اشتیاق سے پوچھا۔
اپنے قدموں میں بیٹھا ہوا یہ ذمہ دار اعلیٰ افسر اس کو بہت دلچسپ نظر آ رہا تھا۔ اور وہ اپنے آپ کو اچانک نے حد اہم محسوس کرنے لگی تھی۔۔۔۔۔۔
اس نے سجاد کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اشتیاق تھا، التجا تھی اور بے صبری۔ اور وہ اپنی عمر سے بہت کم نظر آ رہا تھا۔[18]

اس مکالمے سے ظاہر ہوتا ہے کہ سجاد کے اظہار محبت سے گیتی متاثر ہوئی۔ کیوں کہ اس کے انداز گفتگو اور جسمانی حرکات سے گیتی کو اپنی اہمیت کا احساس ہوا۔ اگرچہ کرنل سجاد گیتی سے عمر میں بہت بڑا تھا مگر اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بے تکلفی اور بے باکی سے اظہار محبت کیا۔ اس کے الفاظ اس کے جذبات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اپنے انداز گفتگو اور جسمانی حرکات سے متاثر کرنا بھی تذکیری خصائص میں شامل ہے۔ گیتی کے قدموں میں بیٹھنا اور اس کو اشتیاق سے دیکھنا گیتی کے لیے اثر انگیز ہے۔ پروفیسر کنور نسیم کا کہنا ہے:

> سجاد بختیار اور اماں بیگم سے اجازت لے کر گیتی آراء کو نتھیا گلی دکھانے لے جاتا ہے جہاں وہ گیتی آراء سے وہ جملہ کہتا ہے جس کی تمنا ہر عورت کو ہوتی ہے یعنی "مجھے تم سے محبت ہے" یہ جملہ گیتی آراء کو آہستہ آہستہ نفسیاتی الجھنوں سے باہر نکال لاتا ہے اور یوں سجاد باوجود عمر رسیدہ ہونے کے گیتی آراء کو شادی پر رضامند کر لیتا ہے۔[19]

مسعود:

مسعود کا تعلق آنند پور سے ہے۔ وہ جہانگیر مرزا کا رشتہ دار ہے مگر کم حیثیت طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ جس علاقے میں رہتا ہے وہاں کے لوگ غربت کا شکار ہیں۔ ایسے علاقے کے لوگ اپنے حال میں مگن اور مستقبل سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ اس کے علاقے کی گلیاں اور مکان تنگ ہیں۔ مسعود کا اپنا گھر بھی چھوٹا سا قدیم طرز کا ہے۔ مگر مسعود کو اپنی حیثیت پر کسی قسم کی ندامت نہیں۔ اس کی تربیت اس انداز سے ہوئی ہے کہ وہ ایک خوددار اور اپنی حیثیت پر مطمئن رہنے والا شخص ہے۔ مسعود جسے اپنی کم حیثیتی پر شرمندگی نہیں ہوتی لیکن وہ جہانگیر مرزا کے گھر میں جاتے رہنے کی وجہ سے اس طبقے کے لوگوں کی کم حیثیت لوگوں کے بارے میں جو رائے ہوتی ہے اس سے بخوبی واقف ہے۔ اسی لیے وہ گیتی کے اپنے گھر آنے پر بے چین ہوتا ہے۔ مگر گیتی مسعود کی شخصیت سے متاثر ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک مسعود کی غربت کوئی معنی نہیں رکھتی: "مسعود کی شخصیت میں جاذبیت تھی۔ وہ تھوڑا مغرور اور تکلیف دہ حد تک خوددار بھی تھا۔ یہ باتیں بے شک اس کو پسند کرنے اور پیار کرنے کے لیے کافی تھیں۔"[۲۰]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسعود جاذب نظر شخصیت کا حامل ہے۔ جو کہ ایک تذکیری خصوصیت ہے۔ یہاں جاذب نظر سے مراد محض اس کی ظاہری خوب صورتی نہیں ہے بلکہ وہ باطنی طور پر بھی جاذبیت کا حامل ہے کیوں کہ خودداری، محنت اور صبر جیسی صفات اس میں پائی جاتی ہیں۔ رابرٹ ووڈ اپنی تھیوری میں مکالماتی انداز کے ضمن میں بیان کرتے ہیں کہ مثالی آدمی صبر کرنے والا، قابل قائد اور جاذب نظر ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مسعود کا کردار بھی ایسا ہی ہے۔ وہ گیتی سے محبت کرتا ہے مگر گیتی کی بہن صولت اپنی دولت کے زعم میں اس کی ماں ہاشمی آپا کی بے عزتی کرتی ہے جس پر ہاشمی آپا مسعود کو کہتی ہیں کہ اگر تو غیرت مند ہے تو اس گھر کا رخ نہیں کرے گا اور مسعود کی منگنی کا منی سے کروا دیتی ہیں۔ وہ اگرچہ اس منگنی سے ناخوش ہے مگر وہ اس پر صبر کر لیتا ہے۔ مسعود میں ایک صفت یہ بھی موجود ہے کہ اس نے اپنی زندگی کا ایک مقصد بنا رکھا ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے دن رات محنت کرتا ہے، وہ صبح کالج میں پڑھتا ہے، شام کو ٹیوشن پڑھاتا اور پھر رات بھر بیٹھ کر اپنے غیر آرام دہ کمرے میں پڑھتا ہے۔ اپنی محنت اور لگن کی بدولت وہ اپنا مقصد حاصل کر لیتا ہے اور انجینئر بن جاتا ہے۔ یہ اس کی شخصیت کی صفات میں شامل ہے کہ اس نے اپنی زندگی کو بے مقصد نہیں گزارا۔ مقصد انسان کے اندر مختلف قوتوں کو جنم دیتا ہے اور جو انسان اپنے مقصد کو پانے کے لیے اپنی قوتوں کو بروئے کار لاتا ہے اور محنت کرتا ہے وہ اپنی منزل کو پا لیتا ہے۔ مسعود کا کردار بھی ایسا ہی ہے۔ جہاں تک مسعود کے مکالماتی انداز کا تعلق ہے تو اس کے مکالمے سے اس کے طبقے کی غمازی ہوتی ہے۔ مسعود کی گیتی سے گفتگو کا انداز ایسا ہے:

گدھی! نامعقول! شرم تو نہیں آتی مجھ پر شک کرتے ہوئے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس لڑکی کو جو اس سے یوں بدظن ہو کر رو رہی تھی، برے سے برے لفظ کہے چلا جائے۔

دھیرے دھیرے اس کا چہرہ اس کے سر کے بالکل نزدیک آگیا تھا اور اس کے سیدھے اور سیاہ
بالوں سے پھر وہی اور مدہوش کن خوشبو آرہی تھی۔ وہ گھبرا گیا اور اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔[۲۱]

اس اقتباس سے مسعود کے مکالماتی انداز کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کا انداز گفتگو اس کی حیثیت کے مطابق ہے۔ حالانکہ وہ پڑھا لکھا شخص ہے اور اس قسم کے الفاظ اسے زیب نہیں دیتے۔ اس کا انداز گفتگو متاثر کن معلوم نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس بختیار کے کردار کو دیکھا جائے تو وہ نہایت ہی معقول اور مناسب الفاظ سے اپنی بات کو بیان کرتا ہے اس کے لہجے میں نرمی پائی جاتی ہے۔ جو کہ سب کو متاثر کرتی ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مسعود کی شخصیت میں جاذبیت پائی جاتی ہے اور وہ صابر اور محنتی انسان ہے جو کہ تذکیری خصائص ہیں مگر اس کا انداز گفتگو قاری کو متاثر نہیں کرتا۔

شہریار:

شہریار کا کردار ناول کے آغاز میں مختصر عرصے کے لیے منظر پر آتا ہے۔ یہ صولت آرا کی شادی پر جلوہ افروز ہوتا ہے۔ اس کی شادی میں رونق لگانے والا شہریار ہی ہے جو سب کو گانے بجانے پر لگاتا اور سب کے ساتھ ہنسی مذاق کرتا ہے۔ یہ خوش طبع شخص رونق محفل ہے۔ بڑوں کی عزت اور چھوٹوں سے شفقت سے پیش آنا اس کی فطرت میں شامل ہے۔ اس کے مکالمے بھی اس کی فطرت کے مطابق ہیں جو کہ مکالموں کی خوبی ہوتی ہے۔ وہ اپنے بہن بھائیوں سے بہت محبت کرتا ہے اور کسی سے بھی تلخ انداز میں گفتگو نہیں کرتا۔ زبان انسان کی شخصیت کو نکھارنے اور بگاڑنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اگر انسان زبان کا صحیح استعمال کرے تو لوگ اس کی عزت بھی کرتے ہیں اور وہ شخص سب کی محبت بھی حاصل کر لیتا ہے۔ مگر جو انسان تلخ کلامی کرتا ہے تو لوگ ایسے انسان سے دور بھاگتے ہیں۔ شہریار کا انداز تکلم سادہ اور ظریفانہ ہے۔ وہ تمام لوگوں کے ساتھ ہنسی مذاق سے بات کرتا ہے اور ظریفانہ فقروں کا استعمال کرتا ہے۔ مکالمہ درج ذیل ہے:

لگ جائیں گے وہ بھی۔ چلو اپنی ڈیوٹی پوری کرو۔ شہریار نے اس کو گھرکا۔ میں کہتا ہوں آخر تم
لوگوں کے گلے کیوں مارے گئے ہیں۔ برسات کی ہوا لگ گئی کیا؟ ہاں بھئی شروع کرو! مہ جبین
نے پھر مستعدی دکھائی۔
ہریالے بنے میرے باغوں مت آنا۔
واہ بھئی وا! بس ایک ڈومنی ہے کام کی۔ شہریار نے مہ جبین کو شاباش دی۔[۲۲]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہریار کا انداز تکلم ظریفانہ ہے۔ مگر وہ کسی کی عزت نفس مجروح نہیں کرتا۔ وہ محض ماحول کو خوش گوار بنانے کے لیے ایسا کرتا ہے تاکہ موقع سے سب مسرور ہو سکیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ متاثر کن شخصیت کا حامل ہے بلکہ ظاہری طور پر بھی جاذب نظر ہے۔ پروفیسر کنور نسیم لکھتے ہیں:

وہ ایک ہنس مکھ اور صلح جو انسان ہے۔ خاندانی شرافت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ وہ اپنی بہنوں کو دل و جان سے چاہتا ہے۔۔ وہ سب کے ساتھ گھل مل جاتا ہے۔ وہ ہنسی مذاق سے چچازاد بہنوں کو بھی چھیڑتا ہے۔[۲۳]

مالی:

مالی ایک وفادار اور نمک خوار ملازم ہے۔ پاکستان بننے پر ہجرت کے لیے وہ جہانگیر مرزا کے خاندان کی مدد بھی کرتا ہے اور ان کی حفاظت بھی۔ مالی کا کردار قیام پاکستان کے بعد ناول میں منظر پر آتا ہے۔ یہ کردار اس لیے بھی اہم ہے کہ اس نے ان کشیدہ حالات میں ہندو ہوتے ہوئے بھی مسلمان گھرانے کی مدد کی اور یہ ثابت کیا کہ وہ ایک نمک حلال اور وفادار ملازم ہے۔ مالی کا انداز تکلم سادہ ہے:

یا اللہ! تو عزت آبرو کی خیر رکھیو۔ انھوں نے دھیرے سے کہا۔

مالی کے کلیجے پر گھونسا سا پڑ گیا:

بٹیا مجھ سے ڈر گئی، اور جب شریف نہ ہوتا تو بیگم صاب بیٹیوں کے ساتھ مجھے گاڑی میں بٹھا کر اسکول بھیجا کرتی تھیں۔ اس کا دل چاہا، گیتی سے کہے بٹیا! مجھ سے کیوں ڈر گئی؟ میں تو باغ کا مالی ہوں۔ میں نے تو پودوں کو سینچنا اور پروان چڑھانا سیکھا ہے۔ اور اب میں کس منہ سے کہوں کہ مالی کے دم میں دم ہے تو آپ کو کوئی ڈر نہیں۔ پھر بھی اس نے ہمت کر کے کہا: بیگم صاب! بہو سے کہہ دیجیے۔ میں جندہ ہوں تو شریف اسی چوکھٹ سے رخصت ہو گا۔ آپ لوگ پھکر نہ کریں۔ میں تو نہیں مر گیا۔[۲۴]

اس مکالمے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مالی کے الفاظ اس کے جذبات سے شدید مطابقت رکھتے ہیں۔ جو کہ ایک تذکیری خصوصیت ہے جسے رابرٹ ووڈ نے اپنی تھیوری میں بیان کیا ہے۔ صاب، جندہ اور پھکر یہ الفاظ مالی نے اپنے لہجے میں ادا کیے ہیں اگرچہ وہ اردو بول رہا تھا مگر اس کا انداز اس کی فطرت اور حیثیت سے مطابقت رکھتا ہے۔ ہر انسان کا انداز تکلم دوسرے انسان سے مختلف ہوتا ہے اس لیے مالی کا انداز بھی دیگر کرداروں سے مختلف ہے اور اس کی حیثیت کی غمازی کرتا ہے۔

چلتا مسافر:

مزمل:

مزمل ایک تعلیم یافتہ شخص ہے۔ اس نے علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی۔ تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس نے کالج میں کئی مضامین میں گولڈ میڈل بھی حاصل کیا اور وہ ایک بہترین ڈبیٹر بھی ہے۔ اسے

اردو، بنگالی، فارسی، عربی، پنجابی اور انگریزی زبانوں پر دسترس حاصل ہے۔ وہ شاعرانہ اور صوفیانہ کلام سے دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ ذہین اور معاملہ فہم شخص ہے۔ وہ اپنے حالات کو بہتر طریقے سے سمجھتا ہے۔ اور ان پر صبر کرتا ہے۔ انسان کی شخصیت میں انداز تکلم نہایت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے انداز تکلم میں شائستگی ہے۔ وہ سب سے محبت سے بات کرتا ہے۔ اسے شاعری سے دلچسپی ہے اور اکثر اپنی گفتگو میں شاعری کا حوالہ دے کر بات کو سمجھاتا ہے۔ وہ اردو سپیکنگ ہے اور اپنی گفتگو سے اپنی تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کے الفاظ اس کے جذبات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ مزمل اپنی گفتگو سے بذلل کو صبر و حوصلہ کی تلقین کرتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر نجمہ صدیق لکھتی ہیں:

> مزمل کو بھی بذلل کی شکل میں اپنا روپ دکھائی دیتا ہے اور وہ بھی اپنے گذشتہ ماضی کو بذلل کے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے اور ہر جگہ بذلل کو اپنے اشعار، صوفیانہ کلام اور نصیحت آموز باتوں سے اس کو مشکل حالات میں صبر اور حوصلے کی ترغیب دیتا ہے۔[۲۵]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے مزمل کی ذات بے ضرر ہے۔ وہ صاف نیت اور رحم دل ہے۔ وہ دوسروں کو ہمت و حوصلہ دیتا ہے اور اس کے انداز تکلم اور شخصیت کی وجہ سے وہ لوگوں میں قابل ستائش مقام حاصل کرتا ہے۔ لوگ اس کے گرویدہ ہوتے ہیں اور یہ تذکیری خصوصیت ہے کہ آپ اپنے بات کرنے کے انداز اور اپنی حرکات و سکنات سے لوگوں کو متاثر کریں۔ مزمل بھی ایسی ہی شخصیت ہے۔ مزمل اور بذلل کے مابین مکالمے کے ذریعے ہم اس کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں:

> بذلل، ادھر آجاؤ، میرے پاس۔" مزمل نے اسے اپنے پاس بلالیا۔ پھر اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اسے سمجھایا، "دل چھوٹا نہ کرو، بذلل۔ تم کو پتا ہے، میں تم کو کتنا پیار کرتا ہوں۔ بیٹا، اس نے، جو میری اور تمہاری جانوں کا مالک ہے، وعدہ کیا ہے کہ فاذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون۔
>
> وہ مزمل کے گلے سے چمٹ گیا۔ "مگر میں کیا کروں؟ میرا دل چاہتا ہے آپ لوگوں کو دل میں چھپا لوں۔ مگر آج میں اتنا بے بس ہوں کہ آپ کو کسی محفوظ ٹھکانے پر بھی نہیں پہنچا سکتا۔"
>
> فکر نہ کر بیٹا۔ اللہ مالک ہے۔
>
> پتا نہیں، وہ آپ کا اللہ کدھر گیا ہوا ہے۔ پتا ہے، آج دن بھر کیا ہوتا رہا ہے؟ معلوم ہے۔
>
> اور آپ ہنس رہے ہیں؟
>
> ہاں، بذلل۔ اچھا، یہ بتاؤ، اب تم کیسے جاؤ گے؟[۲۶]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مزمل 'بذلل کی نفسیاتی کیفیت سمجھ گیا ہے اسی لیے مزمل نے اس کے مطابق گفتگو کی۔ یہی گفتگو کی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ موقع اور حالات سے ہم آہنگ ہو۔ وہ قرآنی آیت کے ذریعے

بذلل کو صبر و حوصلہ کی ترغیب دیتا ہے۔ بذلل کی پیٹھ پر ہاتھ رکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسے حوصلہ دے رہا ہے۔ علاوہ ازیں مزمل خود بھی اپنے حال پر صبر کر چکا ہے۔ اس کے نزدیک یہی مومن کا ایمان ہے کہ وہ صبر سے کام لے اور خدا پر بھروسہ کرے۔ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اس کے صبر و تحمل پر بذلل اور مزمل کا بیٹا مدثر دونوں رشک کرتے ہیں اس کے مکالماتی انداز ایک تعلیم یافتہ اور مہذب شخص کا سا ہے۔ وہ اپنے قول و قرار کا پکا شخص ہے وہ کہتا ہے کہ میں اس سرزمین سے کہیں نہیں جاؤں گا یہیں پر دفن ہوں گا۔ وہ ایسا ہی کرتا ہے۔ رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری میں مکالماتی انداز کے ضمن میں صبر بھی ایک تذکیری صفت بتائی گئی ہے۔ مزمل کے کردار میں صبر جیسی صفت موجود ہے۔

مزمل کی شخصیت میں جاذبیت پائی جاتی ہے۔ مزمل کی شکل و صورت کے حوالے سے ناول میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: "منجھلے بھیا تھے کہ جانو کسی نے سونے کی کان میں بیٹھ کر گھڑا ہو۔ ان کا پتلا نازک سا لمبا اونچا جسم، عجیب عجیب سی سوئی سوئی آنکھیں۔"[۲۷] وہ خوش وضع آدمی ہے، حالات بھی اس کی دل کشی میں کمی نہ لائے۔ وہ مضبوط اعصاب کا مالک ہے اور تحمل جیسی صفت نے اس کو مزید جاذب نظر بنا دیا۔ ناول میں مزمل کا تمام لوگوں سے گفتگو کا انداز اور نرم لہجہ اس کی شخصیت کو مؤثر کُن بناتا ہے۔ یہ کردار رابرٹ ووڈ کی تھیوری کے مطابق تذکیری صفات کا حامل ہے۔

سید صاحب:

سید صاحب تعلیم یافتہ شخص ہیں۔ انھوں نے علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی اور دینی تعلیمات سے بھی لگاؤ رکھتے ہیں۔ ان تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر انھوں نے اپنے مزاج میں شائستگی پیدا کی۔ وہ علامہ اقبال کی شاعری کا مطالعہ بڑے اشتیاق سے کرتے ہیں۔ قائداعظم سے بہت عقیدت رکھتے ہیں اور مشکلات کے باوجود اپنے مقصد سے روگردانی نہیں کرتے۔ سید صاحب کے انداز تکلم میں نرمی اور شگفتگی پائی جاتی ہے جو ان کے پڑھے لکھے ہونے کی دلیل ہے۔ وہ اختلافات کو صبر و تحمل سے برداشت کرتے ہیں اور ہر بات کا جواب دلیل سے دیتے ہیں۔ وہ محض اختلاف برائے اختلاف کے قائل نہیں ہیں۔ وہ اپنی قائدانہ صلاحیت اور شخصیت کی جاذبیت کی وجہ سے لوگوں میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ وہ اپنی بات کو دلائل کے ساتھ نہایت سادہ اور مؤثر انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اس حوالے سے امیر حیدر اور سید صاحب کا مکالمہ درج ہے:

> مزمل کے چہرے پر ناگواری کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ وہ اٹھنے لگا تو اس کے باپ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا۔ "یار کہاں چلا؟ ٹھنڈے دل سے مخالفت کو برداشت کرنے اور مخالف نقطہ نظر کو سننے کا حوصلہ پیدا کر۔ تو کیا کہہ رہے تھے تم امیر حیدر؟
>
> یار کیا کہیں۔ لونڈا بگڑ جائے گا۔ اور بات یہ ہے کہ مجھے ہے اس سے بہت پیار۔

انھوں نے مزمل کو پیار سے دیکھا۔

یوں ہی بگڑ جائے گا؟ تم کتنی بار کہہ چکے ہو کہ پاکستان کا کیڑا جناح کے دماغ میں جو رینگا ہے اس کی جڑ میں انگریز ہے۔ یہ بات مزمل اور تمہارا بیٹا تو کہہ سکتا ہے مگر میں اور تم کیسے کہیں گے جنھوں نے لالہ لاجپت رائے کی تحریریں اور وہ خط پڑھے ہیں جس میں انھوں نے مسلمانوں کے فقط جداگانہ انتخاب کے مطالبے پر یہ تجویز کی تھی کہ مسلم اکثریت کے علاقوں کی جداگانہ ریاست بنا دی جائے۔ یہ کیڑا تو لالہ کے دماغ میں۔۔۔[۲۸]

اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سید صاحب کے الفاظ سادہ ہیں مگر اپنے اندر وسیع مفہوم رکھتے ہیں۔ مزمل کا ہاتھ پکڑنا اور اسے پیار سے دیکھنا جیسی جسمانی حرکات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مزمل کو تحمل کا درس دے رہے ہیں۔ انسان کی گفتگو کا انداز ہی اس کی شخصیت کو دلکش بناتا ہے۔ غصے کی حالت میں غیر مناسب اور تلخ الفاظ کا استعمال کسی بھی انسان کی عزت و مقام میں کمی کا باعث بنتے ہیں۔ اسی طرح سادہ و مناسب الفاظ اور نرم لہجہ انسان کو بلند مقام عطا کرتی ہے۔ سید صاحب بھی نرم لہجہ اور مناسب الفاظ کا استعمال کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ لوگ آپ کی شخصیت سے متاثر ہوتے ہیں۔ وہ متوازن شخصیت کے حامل ہیں اسی وجہ سے ان کے دوستوں میں کانگریسی اور جن سنگھی بھی شامل ہیں۔ وہ غیر متعصب شخص ہیں۔ ڈاکٹر عظمت رباب اور ڈاکٹر محمد اشرف خان لکھتے ہیں: "سید صاحب کے دوست امیر حیدر پکے نیشنلسٹ تھے اور ان کا اپنا بیٹا مسلم لیگ کا حامی تھا لیکن دونوں دوست اپنے اپنے نقطہ نظر کو ایک دوسرے پر ٹھونسنے کے بجائے اس کا احترام کرتے تھے۔"[۲۹]

سید صاحب نے پاکستان کی خاطر اپنی اولادیں قربان کیں اور اس پر صبر بھی کیا۔ تھیوری کے مطابق ان کا انداز تکلم سادہ مگر اثر انگیز ہے وہ اپنی گفتگو کے ذریعے دوسروں کو حوصلہ بھی دیتے ہیں اور سہل انداز میں انھیں اپنی بات سمجھا دیتے ہیں۔ وہ صبر کرنے والے انسان بھی ہیں۔ یہ ان کے تذکیری خصائص ہیں۔

بذل الرحمٰن:

بذل الرحمٰن بنگالی مسلمان لڑکا ہے۔ مزمل سے اسے بہت محبت ملتی ہے اور علم بھی۔ اسے مزمل اور اس کے خاندان سے جذباتی لگاؤ ہے۔ وہ ایک ہنس مکھ لڑکا ہے اور اپنی یونی ورسٹی کے دوستوں سے ہنسی مذاق کرتا ہے۔ اسے سلسبیل سے محبت ہے اور وہ سلسبیل سے بنگالی لہجے میں اردو بولتا ہے جس سے ناول میں اس کے بنگالی ہونے کا تاثر ملتا ہے۔ سلسبیل کو اس کی سادگی بہت پسند ہے وہ اس سے کہتا ہے:

بات یہ ہے شو شبیل کہ ویسے تو تم بالکل عام سی لڑکی ہو۔ تمہاری جیسی درجنوں لڑکیاں دیکھتا ہوں لیکن تمہارا نام بڑا Rare ہے۔ بڑا میٹھا اور میوجیکل (میوزیکل) ہے۔ شول شبیل۔[۳۰]

اس اقتباس سے بذلل الرحمن کا بنگالی لہجہ ظاہر ہوتا ہے یعنی کہ بنگالی کردار اردو بنگالی لہجے میں بولتے ہوئے دکھائی دیتا ہے اور وہ اپنی گفتگو کے درمیان انگریزی کے الفاظ بھی استعمال کرتا ہے۔ اس کا سلسبیل سے بات کرنے کا انداز سادگی لیے ہوتا ہے۔ سلسبیل کو اس کی سادگی اور اس کی بات کرنے کا انداز بہت بھاتا ہے اور وہ معمولی کرتے پاجامے اور چپل میں بالکل ہیرو نہ لگتا تھا مگر اس کی شخصیت کسی ہیرو سے کم نہ تھی۔ وہ بنگالی لہجے میں اردو بولتا اور دنیا کے تمام انقلابوں کی داستانیں سناتا نظر آتا۔ بذلل الرحمن بنگالیوں کی بہاریوں کے لیے نفرت کو غلط تصور کرتا ہے اور اس نفرت کے طوفان کو روکنے کی کوشش کرتا ہے جس سے اس کی قائدانہ صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ کشیدہ حالات میں بھیس بدل کر اپنے ماتحتوں کے ذریعے لوگوں کی مدد کرتا۔ اس کے اندر لوگوں کی مدد کرنے کا جذبہ ہے جو کہ ایک قائد میں ہونا چاہیے۔ وہ منصوبہ بندی کر کے کام کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بہترین قائدانہ صلاحیت ہے۔ جب وہ مدثر کو پاکستان بھیجتا ہے تو وہ مزمل کو تسلی دیتا ہے کہ میں اس کی ذمہ داری کسی اور کو نہیں دے سکتا بلکہ اسے مرلی پہنچائے گا اور آگے بھی وہ اسی کے آدمیوں کے ساتھ جائے گا۔ سرحد پار کرنے کے لیے لوگ پیسہ مانگتے ہیں مگر یہ بنا پیسے کے سرحد پار کر جائے گا کیوں کہ وہاں بھی اپنے تین آدمی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے تمام آدمی خفیہ طور پر کام کرتے ہیں اور لوگوں کی مدد کرتے ہیں جو کہ تذکیری رویہ ہے۔ وہ مدثر کو منصوبہ بندی کر کے بھیجتا ہے جس کا اندازہ اس مکالمے سے لگایا جاسکتا ہے:

> کچھ دیر بعد بذلل نے ایک چھوٹا بریف کیس کھولا۔ کچھ دیر کاغذ نکال نکال کر دیکھتا رہا۔ پھر ایک نقشہ لے کر اس کے تخت کی طرف بڑھا جہاں وہ لیٹا ہوا تھا۔ سمیع اللہ صاحب ذرا لالٹین دیجیے۔۔۔ اس نے نقشہ تخت پر پھیلا دیا۔ یہ دیکھو۔۔ اسے سمجھ لو۔۔۔ بذلل نے نقشے پر انگلی رکھی۔ یہ میمن سنگھ ہے۔ میمن سنگھ سے تم جاؤ گے دیناج پور۔۔ دیناج پور سے تم جاؤ گے، راج شاہی۔ راج شاہی میں تم کو عزیز الحق کے گھر ٹھہرائیں گے۔
>
> عزیز الحق کے پاس؟ وہ کون ہے؟
>
> ہے ہمارا ایک آدمی، مگر عزیز الحق وہاں موجود نہ ہوگا۔ [۱۳]

اس اقتباس سے بذلل الرحمٰن کی قائدانہ صلاحیتیں اور محبت کرنے کا جذبہ ظاہر ہوتا ہے۔ بذلل مکمل منصوبہ بندی کے ذریعے مدثر کو پاکستان بھیجتا ہے تاکہ اس کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہ اٹھانا پڑے۔ اس کے انداز تکلم میں سادگی پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے ماتحتوں کو بہت عزت سے پکارتا ہے۔ یہ بھی ایک قائد کی خوبی ہے۔ رابرٹ ووڈ نے اپنی تھیوری میں مکالماتی انداز کے ضمن میں قائدانہ صلاحیت کا ذکر کیا ہے کہ مثالی آدمی قائدانہ صلاحیتوں کا حامل ہوتا ہے اور وہ اپنی قابلیت کے ذریعے لوگوں میں اہم مقام حاصل کرتا ہے۔ درج بالا اقتباس سے بذلل کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے جو ایک تذکیری خصوصیت ہے۔

مدثر:

مدثر ایک شریف اور خاندانی لڑکا ہے۔ مشرقی پاکستان میں پیدا ہونے کی وجہ سے وہ وہیں تعلیم حاصل کرتا ہے۔ وہاں پر رہنے اور تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے اسے بنگالی پر مہارت حاصل ہے۔ اکثر بذل الرحمٰن بھی اس کی بنگالی سن کر حیران ہوتا ہے اسے یقین نہیں آتا کہ یہ اردو سپیکنگ کا بیٹا ہے۔ مدثر اپنی تعلیم کے حوالے سے اس لیے کڑھتا ہے کہ یونی ورسٹی میں استاد پڑھائی کے بجائے سیاست سکھاتے ہیں۔ یہ ایک جاندار کردار ہے۔ ہنس مکھ اور شریر لڑکا ہے۔ بذل اور سلسبیل سے اس کی دوستی ہے اور وہ ان دونوں سے ہنسی مذاق کرتا ہے۔ مگر جوں جوں مشرقی پاکستان کے حالات میں کشیدگی آئی اس کے مزاج میں بھی سنجیدگی آگئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سپاٹ کردار نہیں ہے بلکہ وہ تبدیلیوں کو محسوس کرتا ہے اور اس کے ساتھ اپنے آپ کو بھی تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کے اعمال و اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے حالات پر صبر و حوصلے سے کام لیتا ہے۔ اس حوالے سے اقتباس درج ذیل ہے:

> وہ اتنے دن سے تنہا تھا۔ اس کی پڑھائی مٹ گئی تھی۔ کوئی بات سننے والا اور کرنے والا بھی نہ ملتا تھا مگر وہ بڑے تحمل سے ہر بات سہہ رہا تھا۔ میں غمگین ہوں گا تو میری ماں کڑھے گی، میرے باپ کا دل ٹوٹے گا، میری بیمار دادی کیا محسوس کرے گی، اس لیے وہ زبردستی ہنستا بولتا اور لطیفے سناتا رہتا تھا۔[۳۲]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تمام حالات کو صبر و ہمت سے برداشت کر رہا ہے۔ جیسا کہ رابرٹ ووڈ نے اپنی تھیوری کے مکالماتی انداز کے ضمن میں بیان کیا ہے کہ مثالی آدمی صبر کرنے والا ہوتا ہے۔ مدثر کا کردار بھی ایسا ہی ہے۔ اس کے حوالے سے ڈاکٹر نجمہ صدیق لکھتی ہیں: "مدثر کے کردار کی مختلف جہتیں سامنے آتی ہیں۔ اور قاری نہ صرف اس کردار کے صبر اور حوصلے کا قائل ہوتا جاتا ہے بلکہ اس کردار سے ہمدردی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔"[۳۳] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مدثر کے کردار میں صبر جیسی تذکیری خصوصیت موجود ہے۔ یہ کردار ناول میں مختصر عرصے کے لیے جلوہ افروز ہوتا ہے۔ مدثر میں زندہ رہنے کی امنگ ہے۔ اسی لیے وہ ہجرت کرنے کے لیے اپنے باپ مزمل کو مناتا ہے۔ اس حوالے سے اقتباس درج ہے:

> اچانک مدثر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا چچو! جس دن آپ نے فیصلہ کیا تھا کہ گھنشیام کا گھر چھوڑ دیں گے، اس دن آپ نے کہا تھا کہ چوہوں کی طرح بل میں مر جانے سے بہتر ہے کہ کھلی فضا میں زندوں کی طرح مر جائیں۔ میں بھی بکری کی طرح اپنے آپ کو ذبح نہیں کروا سکتا۔ آخر مجھے بھی زندہ رہنے کا حق ہے۔ میں اپنے آپ کو ان ہاتھوں سے ہرگز ذبح نہیں کروا سکتا جنہوں نے معصوم بچوں اور لڑکیوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے ہیں۔[۳۴]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مدثر کے مکالماتی انداز میں سادگی اور بے ساختگی موجود ہے اور وہ یہ باتیں فیصلہ کُن انداز میں کرتا ہے۔ وہ یہاں پر بہادری کا بھی مظاہرہ کرتا ہے اور بہادری بھی ایک تذکیری خصوصیت ہے جو مدثر کے کردار میں پائی جاتی ہے۔ دراصل کردار کے مکالمے سے اس کی سوچ، خیالات، فکر اور اس کی حیثیت کی عکاسی ہوتی ہے۔ مدثر کے انداز گفتگو بھی اس کے خیالات کی غمازی کرتے ہیں اس کا مکالماتی انداز جاندار، پُر اثر اور بامعنی ہے جو دیگر کرداروں کے ساتھ قاری کو بھی متاثر کرتا ہے اور قاری کے دل میں اس کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

سمیع اللہ:

سمیع اللہ ناول کا ضمنی بنگالی مسلمان کردار ہے۔ یہ بھی غیر متعصب شخص ہے۔ بذلل کے ماتحت کام کرتا ہے اور مدثر کو پاکستان پہنچانے کی ذمہ داری لیتا ہے۔ وہ کم گو شخص ہے اور معاملات کی سمجھ بوجھ رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ معاملات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے مدثر کو خاموش رہنے کے لیے کہتا ہے۔ سمیع اللہ کا مدثر کو سمجھانے کا انداز مؤثر کن ہے:

> چڑواچباتے چباتے اس نے ایک بار پھر سوال کیا، "سمیع اللہ صاحب، آپ کی Affiliation کیا ہیں؟
>
> خضر جب موسیٰؑ کا ہم سفر بنا تو اس نے موسیٰؑ کو سوال کرنے سے منع کیا، مگر موسیٰؑ نے سوال کیے۔ پے بہ پے سوالوں سے تنگ آکر خضر نے جواب دیئے اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ بس اے موسیٰؑ اب میری اور تمہاری جدائی کا وقت آگیا ہے۔
>
> آپ تو فلسفی معلوم ہوتے ہیں
>
> اور تم کلیم، لیکن میری ایک بات سن کر گرہ میں باندھ لو۔ میرے بعد اپنے کسی رہبر سے سوال نہ کرنا۔ خاموشی تکلم پر بھاری ہوتی ہے۔
>
> خاموش سفر جاری رہا۔[۳۵]

اس مکالمے سے ظاہر ہوتا ہے کہ سمیع اللہ ایک عام بنگالی شخص ہے مگر اس کی گفتگو کا انداز فلسفیانہ ہے جس نے مدثر کو بہت متاثر کیا۔ وہ مدثر کو مشورہ دیتا ہے کہ اب اپنے آگے کے سفر میں کسی سے گفتگو نہ کرے۔ دراصل زبان ہی کی وجہ سے انسان اذیت و مشکلات کا شکار ہوتا ہے۔ لہذا وہ خاموشی کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھے تاکہ وہ کسی مشکل میں نہ پڑے۔ سمیع اللہ عمر میں چالیس پینتالیس سال کا شخص ہے مگر اپنے قد و قامت اور جسمانی لحاظ سے وہ ایک نوجوان لڑکا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا حلیہ دیہاتیوں کا سا ہے مگر اس کا انداز تکلم صوفیانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مدثر

اور بذل الرحمٰن اس کی شخصیت سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو سمیع اللہ میں رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے مطابق لوگوں کو متاثر کرنے کی تذکیری خصوصیت موجود ہے۔

خواب گر:

ابراہیم:

ابراہیم بلتستان کے علاقے تھلے لا کا رہائشی ہے۔ پس ماندہ علاقہ ہونے کے سبب اس علاقے کے لوگوں کو بہت محنت، صبر اور جفاکشی کا مظاہرہ کرنا پڑتا۔ اس علاقے میں نہ تو کوئی سکول تھا اور نہ ہی ہسپتال۔ اس وجہ سے بھی انھیں بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ ابراہیم ایک ذہین شخص ہے اس نے مدرسے میں ملا صاحب سے قرآن شریف پڑھا۔ اسے تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق ہے مگر ایک تو اس علاقے میں تعلیم کی سہولیات میسر نہ تھیں دوسرا گھر کے معاشی مسائل کے سبب اسے میدانی علاقوں میں جا کر ملازمت کرنا پڑی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پڑھ نہیں سکا۔ ناخواندہ اور ان پڑھ ہونے کے باوجود بھی وہ لوگوں سے ان کی حیثیت اور رتبے کے مطابق بات کرنے کا انداز جانتا ہے۔ مکالمے کے حوالے سے عظیم الشان صدیقی کہتے ہیں کہ: "مکالموں میں متکلم کے سن و سال علاقائی و طبقاتی خصوصیات ماحول اور آپسی رشتوں کا لحاظ بھی رکھنا ضروری ہے تا کہ وہ اپنی زبان کے اعتبار سے ایک دوسرے سے ممتاز نظر آسکیں۔"[۳۶] ابراہیم کا کردار بھی ایسا ہی ہے وہ اپنی گفتگو میں رشتوں کا لحاظ رکھنا جانتا ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہ ان کی تہذیب کا خاصا ہے کہ وہ چھوٹوں بڑوں سب کے ساتھ ادب و احترام اور شفقت سے پیش آتے ہیں۔ وہ بلتیوں کے لہجے میں اردو بولتا ہے۔ مزید براں اس کے مکالماتی انداز میں عاجزی اور انکساری پائی جاتی ہے۔ وہ ہمیشہ سچ بولتا ہے جھوٹ اس کی سرشت میں شامل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگوں میں قابل ستائش مقام حاصل کرتا ہے۔ رابرٹ ووڈ کی تھیوری کے مطابق یہ مکالماتی انداز کی ایک تذکیری خصوصیت ہے۔ ابراہیم کے کردار میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔ ابراہیم جاذب نظر بھی ہے۔ مس باربرا کی سوچ سے ابراہیم کی شخصیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

> ان کے طور طریقے اور مزاج بھی بہت شائستہ اور مہذب تھے۔ لڑائی، جھگڑا ان کی فطرت نہ تھا۔ صاف گو، وفادار، طبقاتی اونچ نیچ اور حیثیت سے بے نیاز ہوتے تھے۔ مس باربرا اس نو عمر لڑکے کی ملائمت اور بات سے اسی وجہ سے متاثر ہوئی تھیں۔[۳۷]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابراہیم کی گفتگو کی سادگی نے مس باربرا کو متاثر کیا۔ وہ انتشار پسند نہیں بلکہ صادق القول اور حلیم طبع شخص ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے علاقے کے تمام لوگ ان صفات کے حامل

ہوتے ہیں۔وہ شہر میں رہنے کے باوجود بھی اپنے علاقے کی صفات سے روگردانی نہیں کرتا۔ابراہیم تمام لوگوں سے خواہ وہ اس کا بھائی بھا بھی ہوں،ماں ہو اس کے علاقے کے بزرگ ہوں یا پھر اس کے افسران وہ سب کے ساتھ انتہائی مؤدب انداز میں بات کرتا۔اس کا لہجہ تلخ نہ ہوتا۔زبان ہی انسان کی شخصیت کو دلکش بناتی ہے۔اسی کے ذریعے سے انسان عزت بھی حاصل کرتا ہے اور اسی کی وجہ سے ذلت بھی برداشت کرتا ہے۔اس لیے انسان کو سوچ سمجھ کے مہذب انداز میں گفتگو کرنی چاہیئے۔ابراہیم کا انداز تکلم بھی ایسا مہذبانہ ہے جو وہ تمام لوگوں کو اپنی جانب راغب کر لیتا ہے۔ابراہیم اور فریڈرک ہسٹن کے مابین مختصر مکالمہ درج ذیل ہے:

> میرا اتا جا۔۔بائی(بھائی) ہے میرا۔وہ مجھ سے بڑا ہے اور اس کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ان ہی دنوں تھلے لا کے کچھ لوگ کشمیر اور شملہ کام کی تلاش میں جا رہے تھے۔۔پھر ادے جان نے ملا صاحب سے صلاح کی اور ملا صاحب نے مجھے ان کے ساتھ شملے بھیج دیا۔
>
> اتا جان۔آکا جان،ادے جان۔۔فریڈ ہسٹن نے دل ہی دل میں دہرایا۔ترکی،افغانستان اور بلوچستان کے افغانوں کی نسلوں میں یہ رشتے ان ہی ناموں سے پکارے جاتے ہیں۔۔ابراہیم مجھے معلوم ہے اور پکا یقین ہے،نسلی طور پر تم میرے زر بادشاہ سے ضرور متعلق ہو اور مجھے یقین ہے کہ یہ اتفاق نہیں بلکہ خدا کی مرضی یہی تھی کہ تم مجھے یہاں پر ملے،ایسے وقت میں جب مجھے تم جیسے انسان کی ضرورت ہے۔۔میں یہاں اس جگہ پھرتا پھراتا بہت بار آیا اور یہاں کے لوگوں میں کافی ملتا جلتا رہا،لیکن سچ یہ ہے کہ تم جیسا کھرا اور دل موہ لینے والا آدمی پہلے نہیں ملا۔[۳۸]

اس اقتباس سے ابراہیم کے مکالماتی انداز کا پتا چلتا ہے۔وہ اردو میں بات کرتا ہے مگر اس کا لہجہ بالتیوں کا ہے۔وہ اردو بولتے ہوئے بھی اپنے رشتوں کو انہی ناموں سے پکارتا ہے جو اس کی اپنی زبان میں بولے جاتے ہیں۔اس کا انداز تکلم اور اس کی سادگی اتنی مؤثر کُن ہے کہ فریڈرک ہسٹن جیسے انگریز افسر کا دل موہ لیتا ہے۔اس کی سادگی،شرافت اور صاف گوئی کی وجہ سے ہی فریڈرک ہسٹن پہلی ملاقات میں ہی اسے ملازمت کی پیش کش کر دیتا ہے۔ابراہیم کی جاذبیت اور اس کا پُر اثر انداز تکلم تذکیری تھیوری کے مطابق ہیں۔

علی مردان:

علی مردان اپنے علاقے کا ایک سمجھدار شخص مانا جاتا ہے وہ ایک شریف اور صابر شخص ہے۔اس نے اپنی زندگی میں بہت سے دکھ اور غم سہے۔باپ کی موت،چچا کی موت،ماں کی موت غرض اس کا ہر رشتہ اس سے جدا ہو گیا مگر اس نے صبر کیا یہاں تک کہ اس کی بیوی ماہ رو نے بھی اس سے بے وفائی کی۔اس کا ہر رشتہ ختم ہو گیا اس کی زندگی میں محض اس کا بیٹا اسمعیل خلیل اللہ باقی رہ گیا۔ماہ رو کی بے وفائی پر بھی اس نے صبر کیا اور اس کو تشدد کا نشانہ

نہیں بنایا۔ رابرٹ ووڈ نے اپنی تھیوری میں مکالماتی انداز کے ضمن میں صبر کرنا بھی تذکیری خصائص بتایا ہے اس لحاظ سے دیکھا جائے تو علی مردان نے بھی صبر کیا۔ وہ اپنی بیوی سے کہتا ہے:

> پاگل، گو خیر، میرا نہیں تو اپنے بچے کا خیال کرنا تھا کہ وہ اب دس سال کا ہونے والا ہے۔ خیر، اب تو میرے کام کی تو رہی نہیں۔ جا میں تجھ کو آزاد کرتا ہوں۔ میں نے تجھ کو پہلے بھی عزت دی، اس لیے کہ تو میرے ہی گھر کی عزت تھی۔ اس گھر کی ہر چیز اب بھی تیری ہے۔[۳۹]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علی مردان نے اس موقع پر بھی صبر و حوصلے سے کام لیا نہ ہی تشدد کا رویہ اپنایا اور نہ ہی تلخ کلامی کی۔ بلکہ اس کو ایک طرف لے جا کر اس کو سمجھایا تا کہ وہ لوگوں کے سامنے شرمندہ نہ ہو۔ یہ ایک بہترین مرد کی پہچان ہے کہ وہ عورت کا احترام کرے۔ اس نے اپنی بیوی کو آزاد کر کے اس کی مشکل آسان کر دی۔ اس کا انداز تکلم سادہ ہے اس میں بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ وہ اردو بولتے ہوئے درمیان میں اپنی زبان کے الفاظ کا بھی استعمال کرتا ہے جیسے گو خیر بلتی زبان کا لفظ ہے۔ یہ لوگ میدانی علاقوں میں رہنے کے باوجود اپنی علاقائی صفات اور اپنی زبان کو نہیں بھولتے۔ الطاف فاطمہ نے ان کی زبان کے لفظ ادا کروا کر اس کے مکالمے کو فطری بنایا ہے۔

علی مردان اپنی بستی کے سمجھ دار، دانا اور اچھے لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس نے لاہور میں آ کر ملازمت اختیار کی اور اپنی ایمان داری اور محنت کی وجہ سے وہ اپنے افسران کے نزدیک بہت اہم بن جاتا ہے۔ یہ بہت اچھی بیکنگ کرتا ہے اور اس کے بغیر اس کے مینیجر کو ایسا لگتا کہ بیکنگ کا کام ٹھپ ہو گیا ہے۔ اس کے ہوٹل میں ایک انجینئر آ کر رہا۔ علی مرادن کے ذمے اس کے کام تھے۔ وہ انجینئر علی مردان سے متاثر ہو کر اسے اپنے پاس ملازمت کی پیش کش کرتا ہے:

> نوجوان انجینئر کو اس کی شستگی، شرافت اور حلیمانہ بردباری بہت بھائی۔ وہ اکثر اس کو پکڑ کر اس کے علاقے، اس کے نسلی تحفظات، اوصاف اور خصائل کی باتیں کرتے تھے۔ اور پھر آخر ایک دن انھوں نے وہ بات کہہ دی، جس کا نامعلوم اور ان کہے طور پر اس کو شدید انتظار تھا۔۔۔
> علی مردان میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ چلو۔ میری بڑی خواہش ہے کہ تم میرے پاس کام کرو۔ مجھے تم بہت پسند ہو۔[۴۰]

اس اقتباس سے علی مردان کی شخصیت کی وضاحت ہوتی ہے۔ رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے مطابق مثالی آدمی صبر کرنے والا ہوتا ہے۔ وہ جو بھی بات کرتا ہے اسے سمجھنا آسان ہوتا ہے۔ جاذب نظر ہوتا ہے اور کسی بھی گروپ میں قابل ستائش جگہ حاصل کرتا ہے۔ علی مرادن کا کردار بھی ایسا ہی ہے اس نے اپنی زندگی کے مشکل حالات میں صبر کیا اور اپنی صلاحیتوں اور ایمان داری کی وجہ سے وہ جہاں بھی گیا لوگوں کو متاثر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ

بہت سے لوگ اسے اپنے پاس ملازمت دینا چاہتے ہیں۔ اس کے انداز تکلم میں سادگی موجود ہے اور اس کا لہجہ بھی مہذب ہے۔

فریڈرک ہسٹن:

فریڈرک ہسٹن اپنے والد کرنل البرٹ ہسٹن کی فرنٹیئر فورسز کی سیکریٹ سروس میں تبادلے کی وجہ سے قبائلی علاقوں میں بڑا ہوا۔ اس کی پرورش کرنے والے ملازم گل خانم اور زربادشاہ ہیں جو قبائلی علاقوں سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں پرورش پانے کی وجہ سے فریڈرک ہسٹن عام انگریزوں سے مختلف ہے۔ وہ عام انگریزوں کے برعکس پورک کو کھانا پسند نہیں کرتا۔ اس کی شخصیت میں بھی قبائلی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ وہ بھی سیکریٹ سروس میں کام کرتا ہے اور سات زبانوں کا ماہر ہے۔ شاعری میں بھی دلچسپی رکھتا ہے۔ فریڈرک اپنے ملازموں بالخصوص ابراہیم سے انتہائی شفقت سے گفتگو کرتا ہے۔ مسعود کے ساتھ اس کا انداز گفتگو بے تکلفانہ ہے کیوں کہ مسعود اس کے بچپن کا دوست ہے۔ فریڈرک ہسٹن موقع محل کے مطابق بات کرنا جانتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب جنگ کے دنوں میں مس باربرا اس حوالے سے اس سے بات کرتی اور حالات کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتی تو وہ کوئی بحث نہیں کرتا۔ فریڈرک ہسٹن کے مکالماتی انداز کے حوالے سے ابراہیم کی رائے درج ذیل ہے:

> صاحب کا نرمی اور عاجزی سے بات کرنا اس کو بڑا بھلا لگ رہا تھا۔ اس کا سابقہ اکثر انگریز صاحبوں سے پڑتا تھا اور اس کو ان کا حاکمانہ انداز، ڈپٹ کر بات کرنا اور ملازم کو انسان کی حیثیت نہ دینے کا انداز ناپسند تھا۔ مگر کرنل صاحب کا لہجہ اتنا میٹھا اور مشفقانہ تھا، اتنا احترام دینے والا لہجہ کہ وہ ان کی خاطر کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔[۱۴]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دیگر انگریزوں کے برعکس فریڈرک ہسٹن کا لہجہ اور بات کرنے کا انداز مشفقانہ ہے۔ جس سے احساس ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کو عزت دیتا ہے۔ تلخ کلامی اور تُرش روئی اختیار نہیں کرتا۔ انگریز برصغیر کی عوام کو اپنا محکوم سمجھتے ہیں اور اس لیے ان کے ساتھ حاکموں کا رویہ رکھتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ بھی انسان ہیں۔ فریڈرک ہسٹن ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ اس کی وجہ شاید یہی ہے کہ قبائلی علاقے کے لوگوں کے ہاتھوں اس نے پرورش پائی ہے۔ فریڈرک کے انداز تکلم ہی کی وجہ سے ابراہیم اس سے متاثر ہوا اور اس کے پاس ملازمت کی۔ ابراہیم اور فریڈرک ہسٹن کے مابین گفتگو سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

> مسکراتا ہوا ہنس مکھ اور بے تکلف۔۔ وہ شخص جس کے ساتھ ایک شام سے اگلے دن تک وقت اس نے ست پڑا کے اطراف میں گزارا تھا۔ کیسی جاذب اور دل میں کھب جانے والی شخصیت تھی۔ اس دل میں اتنا غم اور بے شمار فکریں چھپائے ہوئے کیسے ہلکے پھلکے انداز میں بات کرتا تھا۔۔۔ اس کے کانوں میں ابھی بھی اس کی آواز کی بازگشت آرہی تھی۔

ابراہیم! آپ پتھروں کو جوڑ کر چولہا بنائیں گے، آگ روشن کریں گے اور میں جاتا ہوں دیکھتا ہوں کہ ہے کوئی مچھلی جو ہمارا کھانا بننے پر تیار ہو۔[۴۲]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فریڈرک ہسٹن کا انداز تکلم سادہ اور اثر انگیز ہے۔ ابراہیم کو آپ کر کے مخاطب کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مقامی لوگوں کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور نرمی سے ان کے ساتھ بات کرتا ہے۔ اسی وجہ سے ابراہیم اس کی شخصیت سے متاثر ہوتا ہے۔ کیوں کہ انسان کی زبان اور اس کا انداز تکلم ہی ہے جو انسان کو عزت بھی دلواتا ہے اور ذلت میں بھی دھکیل دیتا ہے۔ اس لیے انسان کو سوچ سمجھ کر شائستہ اور مہذب انداز میں گفتگو کرنی چاہیئے۔ فریڈرک کا انداز تکلم بھی مہذب اور اثر انگیز ہے۔

چاچا غلام محمد:

چاچا غلام محمد ہٹلر کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی شکل ہٹلر سے ملتی تھی مگر وہ مزاج کے حوالے سے سیدھا انسان ہے۔ اپنے علاقے سے آنے والے ہر شخص کی مدد کرنا ان کو بہترین مشورہ دینا اس کا کام تھا۔ وہ ان پڑھ تھا مگر حالات حاضرہ پر نظر رکھتا اور خبریں بھی بہت منہمک ہو کر سنتا۔ وہ قومی پریس میں بھی کام کرتا اور اپنے علاقے کی سول ڈیفنس میں بھی ایک اہم منصب پر فائز تھا۔ اس سے اس کی قائدانہ صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس حوالے سے الطاف فاطمہ لکھتی ہیں:

> مگر ان کا یہ ہٹلر اپنی پوری توانائی اور قائدانہ صلاحیتوں کے ساتھ ان کے درمیان رحمت کے ایک فرشتے کا درجہ رکھتا تھا۔ ان کے قصبے یا گاؤں سے جو کوئی روانہ ہوتا تو پرانے آزمودہ کار اور نیچے سے آئے ہوئے لوگ انجانے بالتی لوگوں کو کارآمد ہدایتیں دینے کے ساتھ ساتھ ہٹلر سے ملنے اور رابطہ رکھنے کی تاکید ضرور کرتے۔[۴۳]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چاچا غلام محمد میں قائدانہ صلاحیتیں موجود ہیں جس کو بروئے کار لاتے ہوئے وہ لوگوں کی مدد بھی کرتا ہے۔ ان کی ملازمت اور رہائش کا انتظام بھی کرتا ہے۔ مزید وہ خود بھی سول ڈیفنس میں اہم منصب پر فائز ہے۔ یہ تمام صلاحیتیں کسی کو متاثر کرنے کے لیے کافی ہیں۔ جیسے کہ رابرٹ ووڈ تذکیری تھیوری میں بیان کرتے ہیں کہ مثالی آدمی صبر کرنے والا ہوتا ہے۔ وہ ایک قابل قائد بھی ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ کسی بھی گروپ میں قابل ستائش مقام حاصل کرتا ہے۔ وہ جو بات بھی کرتا ہے اسے سمجھنا آسان ہوتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ چاچا غلام محمد میں یہ تذکیری خصائص موجود ہیں۔ بیری احاطہ میں شام کے وقت جو محفل جمتی اس میں چاچا غلام محمد کو ہی صدر محفل کا مقام حاصل ہوتا۔ تمام لوگ اس کی بات کو بڑے غور سے سنتے اور اس پر یقین بھی کرتے:

ہٹلر اپنی کم سوادی اور جہالت کے باوجود بڑا باخبر تھا اور اس کو ایسی منافقتوں کا تمسخر اڑانے اور ان پر تبصرہ کرنے کا ڈھنگ بھی آتا تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً اپنے لوگوں کا بیری احاطے میں مجمع لگا کر ان کے ذہنوں کو اپنے خیالات کے انجکشن لگاتا۔ حالاتِ حاضرہ پر اس کی گہری نظر تھی۔[۴۴]

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک باخبر انسان ہے اور اپنے لوگوں کو بھی ان حالات سے باخبر رکھتا ہے۔ اس کی بات کرنے کا انداز سادہ مگر مؤثر ہے۔ وہ تبصرہ کرنا بھی جانتا ہے اور ان حکمرانوں پر طنز بھی کرتا ہے۔ علی مردان کو اس پر حیرت ہوتی کہ چاچا ان پڑھ آدمی ہے مگر اس کے باوجود بھی تمام باتوں سے باخبر ہے۔ اس کے ذہن میں اتنی گہری اور سچائی سے بھرپور باتیں کیسے آتی ہیں۔ البتہ وہ کیا اس کے علاقے کے تمام لوگ چاچا غلام محمد سے متاثر تھے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو چاچا غلام محمد میں لوگوں کو متاثر کرنے اور قائدانہ صلاحیت جیسی تذکیری خصوصیات موجود ہیں۔ وہ عام بول چال کی زبان میں گفتگو کرتا جس کی وجہ سے لوگوں کو اس کی بات سمجھنے میں آسانی ہوتی۔

اسمٰعیل:

اسمٰعیل کا کردار ایک بے ضرر انسان کا ہے۔ یہ خاندانی روایتوں کا پاس دار ہے۔ یہ رحم دل اور محبت کرنے والا شخص ہے۔ اس نے بے غرض ہو کر ابراہیم کی مدد کی اور اپنے خاندان کی کفالت کی۔ اس کا انداز گفتگو دھیما اور ملائم ہے۔ یہ تمام لوگوں کے ساتھ چاہے وہ اس کی بیوی ہو یا بھائی سب کے ساتھ محبت سے بات کرتا ہے۔ یہ بزرگوں کے ساتھ نہایت ادب سے کلام کرتا ہے۔ سب لوگ اس کے معزز گھرانے اور اس کی شخصیت کی نرمی کے سبب اس کو پسند کرتے ہیں۔ اس نے اور اس کی بیوی سکینہ نے ابراہیم کی بیٹی ماہ رو کی پرورش اپنی بیٹی کی طرح کی اور اسے بے حد پیار و محبت دیا۔ اس کا اندازہ اس مکالمے سے لگایا جا سکتا ہے:

> ارے میری بیٹی کیوں روئی تھی؟ ضرور تم نے کوئی شرارت کی ہوگی۔ اسمٰعیل نے ماہ رُو کے سر پر ہاتھ رکھا۔
>
> نہیں ابا جان، میں نے کوئی شرارت نہیں کی۔ اس کا اپنا دل اداس ہے۔ کہتی ہے چاچا صاحب کے جانے سے گھر اداس ہو گیا ہے۔ بالکل اسی طرح جب ہماری دادی جان فوت ہو کر اللہ پاک کے پاس گئی تھیں۔
>
> اسمٰعیل کے دل پر گھونسا پڑا۔ اس کا دل گھر میں گھسنے کو نہیں چاہتا تھا۔۔ اس نے جھک کر ماہ رو کو اپنے کندھوں پر بٹھا لیا۔ اب بول۔ اب تو جانے کو جی کرے گا۔ ماہ رو کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ہاں بس ایسے ہی ہنستی رہا کر۔۔ تُو تو امانت ہے میرے پاس۔[۴۵]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسمٰعیل بچوں کے ساتھ سادہ اور شفقت بھرے انداز میں بات کرتا ہے۔ اسمٰعیل کا ماہ رو کے سر پر ہاتھ رکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسے تسلی دے رہا ہے کہ وہ باپ کی شفقت و محبت سے محروم نہیں ہے بلکہ وہ اس کا باپ ہی ہے جو ہمیشہ اس کی حفاظت کرے گا۔ اسمٰعیل کا کردار ایسا ہے کہ قاری بھی اس سے متاثر ہوتا ہے اس کے مزاج کا دھیما پن اور محبت کے جذبات، دوسروں کی مدد کرنا جیسی تذکیری خصوصیات کے سبب یہ ایک مؤثر کن شخصیت ہے۔

الطاف فاطمہ نے اپنے کرداروں کے ذریعے جس طرح کے مکالمے ادا کروائے ہیں وہ اثر انگیز ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر نجمہ صدیق لکھتی ہیں:

> الطاف فاطمہ نے عمدہ کردار نگاری کے ساتھ مکالمہ نگاری کا بھی خوب صورت آہنگ پیش کیا ہے۔ کرداروں کی زبان سے نکلے ہوئے جملے ان کی شخصیت کی بہترین غمازی کرتے ہیں۔ انہوں نے کسی بھی کردار کی زبان سے ایسے مکالمے ادا نہیں کروائے جس سے کردار کی زبان اجنبی محسوس ہو بلکہ یہاں کردار اور مکالمے ایک وحدت میں ڈھل کر سامنے آتے ہیں۔[۴۶]

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان کے ناولوں کے بیشتر کرداروں میں تذکیری خصوصیات نظر آتی ہیں۔ ہر کردار اپنی حیثیت، پیشے، رتبے کے لحاظ سے گفتگو کرتا ہے جو ان کی شخصیت کی غمازی کرتی ہے۔ ان کے تذکیری کردار دوسروں کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ عام بول چال کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں جس سے ان کی تہذیب کی نمائندگی ہوتی ہے۔ ان کے کرداروں میں قائدانہ صلاحیت جیسی تذکیری خصوصیت موجود ہے جیسے ناول "چلتا مسافر" کا کردار بذل الرحمٰن قائدانہ صلاحیتوں کا حامل ہے اور وہ اپنی قائدانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ملک کے کشیدہ حالات میں لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ اسی طرح "دستک نہ دو" کا کردار صفدر یاسین عام پھیری والوں سے مختلف ہے۔ وہ اپنی گفتگو میں مختلف اشعار کا بھی استعمال کرتا ہے جس سے اس کے شعری ذوق کا پتا چلتا ہے۔ وہ اپنے مکالماتی انداز سے لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔ الطاف فاطمہ کے مرد کرداروں میں تذکیری صفات نظر آتی ہیں۔

حوالہ جات

۱. ڈاکٹر اسلم آزاد، اردو ناول آزادی کے بعد (یوپی: نکھار پبلی کیشنز، ۱۹۸۱)، ص ۲۶۔

۲. احسن فاروقی، ناول کیا ہے (لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۰ء)، ص ۳۶۔

۳. عظیم الشان صدیقی، اردو ناول - آغاز و ارتقاء (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۸)، ص ۳۹۔

۴. محمد نصر اللہ خان ، اردو شاعری میں مکالمہ نگاری کی روایت (شنکر گٹہ: کوئمپو یونی ورسٹی، ۲۰۱۳)، ص ۲۴۔

۵. الطاف فاطمہ، نشان محفل (لاہور: دارالبلاغ، س ن)، ص ۲۳۲۔

۶. ایضاً، ص ۱۷۴۔

۷. ایضاً، ص ۳۷۵۔۳۷۶۔

۸. ایضاً، ص ۴۴۰۔

۹. ایضاً، ص ۴۵۶۔

۱۰. ایضاً، ص ۱۶۷۔

۱۱. ایضاً، ص ۲۸۵۔

۱۲. ایضاً ۵۷۔

۱۳. ایضاً، ص ۱۷۔

۱۴. تسنیم آصف ، الطاف فاطمہ کی ناول نگاری : فکری و فنی جائزہ (مقالہ برائے ایم فل، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد، ۲۰۰۴ء)، ص ۳۷۔۷۴۔

۱۵. الطاف فاطمہ، دستک نہ دو (لاہور: فیروز سنز، س ن)، ص ۴۵۔۴۶۔

۱۶. ایضاً، ص ۳۰۳۔۳۰۴۔

۱۷. ایضاً، ص ۶۰۲۔۶۰۳۔

۱۸. ایضاً، ص ۷۷۰۔۷۷۲۔

۱۹. پرفیسر کنور نسیم، دستک نہ دو: مکمل شرح (لاہور: علی گڑھ پبلشرز، ۲۰۰۷)، ص ۴۷۔

۲۰. الطاف فاطمہ، دستک نہ دو (لاہور: فیروز سنز، س ن)، ص ۱۷۶۔

۲۱. ایضاً، ص ۲۸۳۔

۲۲. ایضاً، ص ۱۱۶۔

۲۳. پرفیسر کنور نسیم، دستک نہ دو: مکمل شرح (لاہور: علی گڑھ پبلشرز، ۲۰۰۷)، ص ۴۴۔

۲۴. الطاف فاطمہ، دستک نہ دو (لاہور: فیروز سنز، س ن)، ص ۶۵۵۔

۲۵. ڈاکٹر نجمہ صدیق، پاکستانی خواتین کے رجحان ساز ناول (لاہور: اظہار سنز، ۲۰۰۸)، ص ۲۵۲۔۲۵۳۔

۲۶. الطاف فاطمہ، چلتا مسافر (لاہور: جمہوری پبلیکیشنز، ۲۰۱۶ء)، ص ۱۸۷۔۱۸۸۔

۲۷. ایضاً، ص ۱۵۔

۲۸. ایضاً، ص ۴۹۔

۲۹. ڈاکٹر عظمت رباب، ڈاکٹر محمد خان اشرف، "آزادی کا تصور، ہجرت اور چلتا مسافر" مشمولہ نور تحقیق جلد دوم، شمارہ ۷: ص ۸۵۔

۳۰. الطاف فاطمہ، چلتا مسافر (لاہور: جمہوری پبلیکیشنز، ۲۰۱۶ء)، ص ۱۳۹۔

۳۱. ایضاً، ص ۲۵۱۔

۳۲. ایضاً، ص ۲۳۲۔

۳۳. ڈاکٹر نجمہ صدیق، پاکستانی خواتین کے رجحان ساز ناول (لاہور: اظہار سنز، ۲۰۰۸)، ص ۲۵۹۔

۳۴. الطاف فاطمہ، چلتا مسافر، ص ۲۴۳۔

۳۵. ایضاً، ص ۲۵۹۔

۳۶. عظیم الشان صدیقی، اردو ناول - آغاز و ارتقاء (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۸)، ص ۳۹۔

۳۷. الطاف فاطمہ، خواب گر (لاہور: جمہوری پبلیکیشنز، ۲۰۱۶ء)، ص ۱۷۷۔

۳۸. ایضاً، ص ۹۸۔

۳۹. ایضاً، ص ۲۵۲۔

۴۰. ایضاً، ص ۲۴۸۔

۴۱. ایضاً، ص ۱۸۹۔

۴۲. ایضاً، ص ۱۱۱۔

۴۳. ایضاً، ص ۲۲۵۔

۴۴. ایضاً، ص ۲۴۶۔

۴۵. ایضاً، ص۵۹۔

۴۶. ڈاکٹر نجمہ صدیق، پاکستانی خواتین کے رجحان ساز ناول (لاہور: اظہار سنز، ۲۰۰۸)، ص۲۵۹۔

ماحصل

ماحصل

Masculinity کے لیے اردو میں "تذکیریت" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ تذکیریت سے مراد وہ کردار، رویے اور صفات ہیں جو کسی مخصوص معاشرے میں مردوں اور لڑکوں کے لیے مناسب سمجھی جاتی ہیں۔ انھیں بڑے پیمانے پر معاشرتی یا سماجی طور پر تعمیر کیا جاتا ہے۔ یہ کسی بھی معاشرے میں مردوں کے مقام کو واضح کرتا ہے۔ تذکیریت کی وضاحت خطرہ مول لینے کی خواہش، خود انحصاری، مضبوط شخصیت کا مالک ہونا، قائدانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنا، اپنے عقائد کا دفاع کرنا اور عقلی طور پر کام کرنا جیسی خصوصیات سے کی جاتی ہے۔ ایک حقیقی آدمی بننے کے لیے ایک فرد کو حاکم، مسابقتی، خود انحصار، خود مختار اور جارح طور پر دیکھنا ضروری ہے۔

اس مقالے میں الطاف فاطمہ کے ناولوں کو ان سوالات تحقیق کے تناظر میں دیکھا گیا ہے۔

۱۔ الطاف فاطمہ کے ناولوں کے مرد کرداروں میں کون سی تذکیری صفات پائی جاتی ہیں؟

۲۔ الطاف فاطمہ کے ناولوں کے مرد کردار مثالی آدمی کی تشکیل کرتے ہیں یا تردید؟

مقالے میں رابرٹ ووڈ (Robert Wood) کی تذکیریت کی تھیوری کو بطور نظریہ عملی اطلاق کیا گیا ہے۔ رابرٹ ووڈ سٹینڈ آؤٹ بکس کے ایڈیٹر اور ایک بلاگ مینیجر ہیں۔ انھوں نے تذکیریت کی جو تھیوری پیش کی۔ اس کے نکات درج ذیل ہیں۔

۱۔ صنفی کارکردگی (Gender Performativity)

۲۔ مثالی آدمی (Ideal man)

۳۔ تحریر میں مثالی تذکیری صفات کی وضاحت (Defining Ideal Masculinity in Writing)

۴۔ مرد کی نفسیات کے متعلق روایات (Male Psychological Narratives)

۵۔ مردانہ مکالماتی انداز اور جسمانی حرکات (Male Dialogue and Body Language)

۶۔ تذکیریت کا مکالماتی انداز (Masculinity as a Dialogue)

۷۔ مرد کے کردار پر لکھنا (Writing Male Character)

اس کے علاوہ رابرٹ ووڈ کے نزدیک تذکیریت کے چند عمومی خصائص بھی ہیں۔

بہادری (Bravery)

جبریت (Stoicism)

تنہائی پسندی (Isolationism)

قائدانہ صلاحیت (Leadership)

جسمانی طاقت (Physical ability)

الطاف فاطمہ کے مرد کرداروں کی تذکیری خصوصیات، صفات اور ان کی پیش کش کے انداز کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے تمام ناولوں میں مرد کو بطور حاکم ہی پیش کیا ہے۔ ان کے ناولوں کا ایک ایک کر کے جائزہ لیا جائے تو ہر ناول کے مرد کردار اپنی کچھ خصوصیات کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں۔

"نشان محفل" کے کردار سید نادر حسین کو دیکھا جائے تو یہ کردار مثالی خصوصیات رکھتا ہے۔ رابرٹ ووڈ کی تھیوری کے مطابق مثالی مرد وہ ہے جو ہر لحاظ سے بہتر ہو۔ ذہنی، تخلیقی۔ نادر کا کردار بھی ایسا ہی ہے۔ وہ تمام معاملات کو بہتر طریقے سے سرانجام دینے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ تمام رشتوں کو خوش رکھتا ہے۔ اس میں دوسروں کی خاطر جینے کے جذبات موجود ہیں۔ ذہنی لحاظ سے بہتر ہونے کی بات کی جائے تو وہ فنونِ لطیفہ کا طالب علم ہونے کی بناء پر فلسفہ پر گہری نظر رکھتا ہے۔ اس کا ایک مقصد "فلسفہ جمال" پر کتاب لکھنا بھی ہے۔ جس کے لیے وہ دن رات محنت کرتا ہے۔ اسے اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کی لگن ہے اور مرنے سے پہلے وہ اپنی کتاب مکمل کر لیتا ہے۔ رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے مطابق تشدد کو روکنا تذکیریت کے خصائص میں شامل ہے۔ ایسا کردار ہیرو کہلانے کا مستحق ہے۔ جب کہ غیر تذکیری کردار تشدد کی تلاش کرتا ہے۔ وہ وولن ہوتا ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو نادر کے کردار میں تشدد کو روکنے یا اختیار نہ کرنے کی خصوصیت موجود ہے۔ وہ نہایت ہمت و حوصلے سے کام لیتے ہوئے خاموشی سے روبینا کو طلاق دیتا ہے اور ساتھ ہی اس کے اخراجات کے لیے کچھ رقم دے کر اس کی مدد کرتا ہے۔ یہ بات نادر کے مضبوط کردار کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ نادر میں مدد کرنے کے جذبات بھی موجود ہیں۔ وہ اپنے شاگردوں، ملازموں سب کی مدد کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اعلیٰ اخلاق کے سب ہی قائل ہیں۔ چاہے وہ اس کے ملازم ہوں، خانزادہ گل نواز ہوں یا اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے والا شاگرد ہو یا اس کی بے وفا بیوی۔ تمام لوگ اس کی نیک سیرتی اور اعلیٰ اخلاق کے قائل ہیں۔ نادر کا کردار سب کا خیال رکھنے والا اور مدد کرنے والا ہے۔ رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے مطابق مدد کرنا، دوسروں کی درست ہنمائی کرنا بھی تذکیری خصوصیات ہیں اور نادر کے کردار میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔ مگر اس کی ایک خامی یہ ہے کہ اس نے لوگوں پر اندھا اعتماد کیا اور یہی اعتماد اس کی زندگی میں مشکلات کا سبب بنا۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو نادر کا کردار ہر لحاظ سے بہتر ہے وہ ذہنی صلاحیت اور اعلیٰ اخلاق کا مالک ہے، دوسروں کی مدد کرنا اور تشدد کو روکنا جیسے تذکیری خصائص کا حامل ہے۔

اسی طرح "نشان محفل" کا کردار ایبک ہے۔ ایبک نادر کا شاگرد ہے۔ یہ لاابالی فطرت کا مالک ہے۔ ایبک کے کردار میں خودداری جیسی صفت بھی موجود ہے۔ رابرٹ ووڈ اپنی تھیوری میں بیان کرتے ہیں کہ بچوں

،بڑوں، مردوں اور عورتوں کی مدد کرنا بھی تذکیری خصوصیات میں شامل ہے اگرچہ ایبک کا کردار نہایت بد مزاج دکھایا گیا ہے مگر ہجرت کے موقع پر اس کے مزاج میں خاصی تبدیلی آئی اور وہ سنجیدہ اور خاموش ہو گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب ہر شخص اپنی ذات اور اپنی ضروریات کے متعلق سوچتا ہے مگر ایبک کا کردار ایسا نہیں ہے اس میں مدد کرنے کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ایبک مثالی آدمی کے کردار پر پورا نہیں اترتا کیوں کہ اس میں برائی اور تشدد جیسا غیر تذکیری رویہ پایا جاتا ہے مگر اس کے باوجود اس میں چند تذکیری خصائص بھی موجود ہیں جس میں خودداری، حقیقت پسندی اور دوسروں کی مدد کرنا جیسے خصائص شامل ہیں۔

"نشان محفل" کا ایک اور اہم کردار محمود ہے۔ رابرٹ ووڈ کی تھیوری میں صبر اور جذبات پر قابو پانا جیسے تذکیری خصائص کو بیان کیا گیا ہے اور محمود کے کردار میں یہ خصائص موجود ہیں۔ یہاں یہ دکھایا گیا ہے کہ وہ بچہ ہوتے ہوئے بھی اپنے جذبات اور دلی کیفیات کا اظہار نہیں کرتا۔ بچے کو جب بچپن میں بہت لاڈ پیار ملتا ہے تو اس کی عادتیں بگڑ جاتی ہیں مگر محمود کا کردار ایسا نہیں ہے وہ اپنی ماں کے پاس آنے کے بعد بھی اس سے کوئی ضد اور کسی قسم کی شکایت نہیں کرتا اس کے اندر ایبک یا اس کے بچوں کے لیے نفرت کا جذبہ نہیں پایا جاتا ہے بلکہ وہ ان کا خیال رکھتا ہے۔ جب کے عام زندگی میں دیکھا جائے تو اس طرح کے واقعات کا بچوں پر بہت برا اثر پڑتا ہے اور ان کے اندر بدلہ لینے کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے مگر محمود کا کردار ایسا نہیں ہے وہ تشدد اور برائی کو فروغ نہیں دیتا۔ محمود کے کردار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زندگی کے پیچ و خم نے اس کی تعمیر و تشکیل کی ہے۔ اس میں تذکیریت کے خصائص موجود ہیں۔ زندگی نے اسے سنجیدہ، کم گو اور صابر شخص بنا دیا۔ رابرٹ ووڈ اپنی تھیوری میں بیان کرتا ہے کہ مرد مشکل حالات کا ہمت اور جواں مردی سے مقابلہ کرتا ہے، وہ صبر کرنے والا ہوتا ہے اور اپنے جذبات پر قابو پانا جانتا ہے۔ محمود میں وہ تذکیری خصائص موجود ہیں جس کا تھیوری میں ذکر کیا گیا ہے۔ وہ روتا نہیں ہے اسے اپنے جذبات پر قابو پانا آتا ہے۔ دراصل یہ ہمارے معاشرے کے متعین کردہ رویے ہیں۔ محمود نے اپنی زندگی کے تجربات سے یہ سب سیکھا۔ لہٰذا مشکل حالات کا ہمت سے مقابلہ کرنا، صبر کرنا اور اپنے جذبات پر قابو رکھنا جیسے خصائص محمود کے کردار میں موجود ہیں۔

"نشان محفل" کا ایک اور تذکیری کردار اویناش کا ہے۔ ہمارے معاشرے میں دو طرح کے رویے پائے جاتے ہیں ایک تشدد اور برائی کا، دوسرا تشدد کو روکنے اور بھلائی کو فروغ دینے کا۔ اویناش کا کردار مؤخر الذکر کردار سے مطابقت رکھتا ہے جو کہ تذکیری کردار ہے۔ رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے مطابق اویناش کے کردار میں جذبات پر قابو رکھنا، درست رہنمائی کرنا، اور مدد کرنا جیسے تذکیری خصائص موجود ہیں۔ اس لیے یہ کردار ناول میں اہمیت کا حامل ہے۔

"نشان محفل" کا ایک کردار خانزادہ گل نواز ہے۔ رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے مطابق مثالی آدمی کی ایک تذکیری خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ دوسروں کی مدد اور درست رہنمائی کرتا ہے اور بھلائی کو فروغ دیتا ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو خانزادہ گل نواز ایبک کی رہنمائی کر کے اسے تشدد اور برائی کرنے سے روکتے ہیں لہٰذا یہ ان کی تذکیری صفت ہے۔ پٹھانوں سے مہمان نوازی، پردہ، اخلاص، غیرت اور وطن دوستی جیسی صفات وابستہ ہیں۔ خانزادہ گل نواز کا کردار مکمل شخصیت کا مالک ہے ان میں دوسروں کو متاثر کرنے کی صلاحیت بھی موجود ہے اور وہ تشدد اور برائی کو روکتے ہیں، دوسروں کی درست رہنمائی کرتے ہیں اور صبر و ہمت جیسے تذکیری خصائص ان کے کردار کا حصہ ہیں۔

نشان محفل کے مردانہ کرداروں میں تذکیری خصائص موجود ہیں مگر ایبک کا کردار ایسا ہے کہ وہ غیر تذکیری ہونے کے باوجود اس میں چند تذکیری خصائص پائے جاتے ہیں۔

ناول "دستک نہ دو" میں بھی کئی تذکیری خصوصیات رکھنے والے کردار موجود ہیں۔ سب سے پہلے صفدر یاسین کے کردار کو دیکھا جائے یہ ناول "دستک نہ دو" کا مرکزی مرد کردار ہے۔ یہ چین کا باشندہ ہے۔ اس کردار کے ذریعے الطاف فاطمہ نے چینی تمدن کی وضاحت بھی کی ہے۔ صفدر یاسین کے کردار میں مثبت سوچ پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے اہل خانہ اور رشتہ داروں کا کفیل ہے اس لیے وہ دن رات محنت و مشقت کرتا ہے اور صبر سے کام لیتے ہوئے مشکل حالات کا جواں مردی سے مقابلہ کرتا ہے۔ رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے مطابق مشکل حالات کا جواں مردی سے مقابلہ کرنا، صبر اور بہادری تذکیری خصوصیات ہیں۔ رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے مطابق مثالی آدمی وہ ہے جو بہادر ہو۔ مشکل حالات کا جواں مردی سے مقابلہ کرے۔ دیگر کرداروں یعنی مردوں، عورتوں اور بچوں کی مدد کرے۔ اور لوگوں کی درست رہنمائی کر سکے۔ صفدر یاسین کا کردار بھی ایسا ہے۔ درست رہنمائی کے حوالے سے دیکھا جائے تو صفدر یاسین نے صولت کی بھی درست رہنمائی کی۔ صفدر یاسین تذکیری رویے کو قائم رکھتے ہوئے گیتی سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کرتا۔ صفدر یاسین میں تخلیقی صلاحیت موجود ہے۔ وہ شاعری اور مصوری میں دل چسپی رکھتا ہے۔ وہ فارغ اوقات میں پینٹنگ اور مجسمہ سازی بھی کرتا ہے۔ اسے مصوری کر کے تسکین حاصل ہوتی ہے۔ کیوں کہ یہ ایک فن کار بھی ہے اسی لیے اس میں احساسات و جذبات کا عنصر زیادہ پایا جاتا ہے اور وہ سب سے محبت و ہمدردی کرتا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو صفدر یاسین کے کردار میں مثالی آدمی کی خصوصیات موجود ہیں۔

"دستک نہ دو" کا دوسرا بنیادی کردار بختیار کا ہے۔ یہ بہت مضبوط، توانا اور جاندار کردار ہے۔ رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے مطابق مثالی آدمی وہ ہے جو ہر لحاظ سے بہتر ہو۔ وہ محض زندگی کے ایک پہلو پر توجہ نہ دے بلکہ تمام پہلوؤں پر نظر رکھے اور اپنی ذہنی صلاحیت سے تمام معالات کو حل کرنے کی کوشش کرے۔ جیسا کہ مرد

کے ذمہ خارجی امور کے ساتھ ساتھ گھریلو ذمہ داریاں نبھانا بھی فرض ہوتی ہیں۔ اگر مرد ان ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے انجام نہ دے سکے تو وہ تذکیری خصائص کا حامل نہیں ہوتا۔ مگر بختیار کا کردار جہانگیر مرزا کی وفات کے بعد فرض شناس ثابت ہوتا ہے۔ اس نے اپنے باپ کی زمینوں اور بینک کے معاملات کے ساتھ ساتھ گھر کی جانب بھی توجہ دی اور ہر ممکن کوشش کی کہ گھر کے ماحول کو ساز گار بنا سکے۔ بختیار میں ان ذمہ داریوں کی وجہ سے اتنی تبدیلی آئی کہ وہ سنجیدہ اور ذمہ دار شخص بن گیا۔ اس نے اپنی بہنوں کو بڑے بھائی اور گھر کے سربراہ کی حیثیت سے نرم اور مشفقانہ لہجے میں سمجھایا کہ وہ آپسی اتفاق سے گھر کے ماحول کو بہتر بنائیں اور اپنی ماں کا خیال رکھیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ باپ کے انتقال کے بعد اس کے گھر والوں کو کسی مشکل یا پریشانی کا سامنا ہو۔ اس کے لیے اس نے تمام معاملات کو سلجھانے کی کوشش کی۔ یہ اس کی تذکیری خصوصیت ہے۔ تذکیری تھیوری کے حوالے سے مرد عورتوں کی نسبت اپنے جذبات کا اظہار کم کرتے ہیں۔ یہ کہنا کہ مرد کے اندر جذبات نہیں پائے جاتے بالکل غلط ہے۔ مرد بھی انسان ہے اس میں بھی جذبات پائے جاتے ہیں مگر مرد چوں کہ جسمانی اور اعصابی لحاظ سے مضبوط ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرتا۔ اپنے جذبات کو چھپانا یا اظہار نہ کرنا بھی تذکیری خصائص میں شامل ہے۔ بختیار بھی اپنے والد جہانگیر مرزا کی موت کے غم کو اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے۔ وہ دوسروں پر عیاں نہیں کرتا کہ وہ کتنا افسردہ اور تنہا محسوس کر رہا ہے۔ وہ صبر سے کام لیتا ہے۔ بختیار کی شخصیت میں دوسروں کی مدد کرنا جیسی تذکیری خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو بختیار کی شخصیت ہر لحاظ سے بہتر ہے اس نے بیرونی معاملات کے ساتھ ساتھ گھر کے معاملات کی طرف بھی توجہ دی، اس میں ہمدردی، صبر اور دوسروں کی مدد کرنا جیسے تذکیری خصائص موجود ہیں۔ اس لیے یہ ایک تذکیری کردار ہے۔

"دستک نہ دو" کا ایک اہم کردار مسعود بھی ہے۔ مسعود جہانگیر مرزا کی رشتہ دار ہاشمی آپا کا بیٹا ہے۔ یہ بچپن میں ہی یتیم ہو جاتا ہے۔ مگر ہاشمی آپا کی تربیت اس انداز سے کرتی ہیں کہ اس میں خودداری پیدا ہو جاتی ہے۔ مسعود کو اپنی غربت پر شرمندگی نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے حالات سے ہر حال میں مطمئن رہتا ہے۔ مسعود کے کردار میں چھوٹی عمر سے ہی عزت نفس اور خودداری جیسی صفات پائی جاتی ہیں۔ جذبات پر قابو پانا تذکیری خصائص میں شامل ہے۔ مردوں کو ہمیشہ سکھایا جاتا ہے کہ اپنے جذبات کو کسی کے سامنے ظاہر نہ کریں اسی کو میں تذکیریت کا حامل ہونا کہتے ہیں۔ مرد کو اپنے جذبات چھپا کر رکھنے چاہیے اور اگر وہ ایسا کرنے سے قاصر ہیں تو یہ ان کے لیے خامی تصور کی جاتی ہے۔ وہ شخص حقیقی کردار کا مالک ہے جو اپنے احساسات کو چھپالے۔ مسعود کا کردار بھی ایسا ہی ہے اس نے گیتی سے اپنی محبت کا اظہار نہ کیا۔ اور اپنے جذبات چھپائے رکھے۔ مسعود کے کردار کا ایک مثبت پہلو یہ بھی ہے کہ اس کی منگنی کامنی کے ساتھ اگرچہ زبردستی کی گئی۔ وہ اس منگنی سے ناخوش ہے مگر اس کے باوجود اس نے کامنی کو

خوش رکھا۔ جیسا کہ انسان اپنی ناکامی پر رد عمل کے طور پر تشدد کا رویہ اختیار کرتا ہے اس نے ایسا نہ کیا بلکہ وہ ایک ایسے انسان کی صورت میں دکھائی دیتا ہے جو کسی کو بلاوجہ اس کے ناکردہ گناہوں کی سزا نہیں دیتا۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مسعود کا کردار جاندار ہے اس میں جذبات پر قابو پانا، محنت، صبر اور جرأت جیسے تذکیری خصائص پائے جاتے ہیں۔

مالی (مرلی) کا کردار "دستک نہ دو" میں تذکیری حوالے سے اہم ہے۔ یہ ایک ہندو کردار ہے۔ مرلی مالی میں انسان دوستی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ اسی لیے وہ گیتی اور اماں بیگم کی مدد کرتا ہے۔ رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے تناظر میں مالی میں مدد کرنے اور انسان دوستی جیسی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مرلی کے اندر یہ تمام صفات موجود ہیں اس لیے یہ ایک تذکیری کردار ہے۔

جہانگیر مرزا کا کردار "دستک نہ دو" کا ایک ایسا کردار ہے جو شاید ناول کی ضرورت کے لیے تخلیق کیا گیا۔ رابرٹ ووڈ کے مطابق مثالی آدمی ہر لحاظ سے بہتر ہوتا ہے۔ زندگی کے تمام پہلوؤں پر اس کی نظر ہوتی ہے۔ مگر جہانگیر مرزا کے کردار میں یہ خصوصیت نہیں پائی جاتی۔ وہ گھر کا نظم و نسق نہیں سنبھال سکتا نہ ہی کوئی مدلل رائے رکھتا ہے۔ نیز یہ ایک جامد کردار ہے جس میں ارتقا نظر نہیں آتا ہے مگر اس میں دوسروں کی مدد کرنا، درست رہنمائی کرنا اور جاذب نظر ہونا جیسے تذکیری خصائص موجود ہیں۔

ناول "دستک نہ دو" کا ایک کردار شہریار بھی ہے۔ کہ شہریار کا کردار حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ وہ ہمت و حوصلہ ہار بیٹھتا ہے۔ اس لیے اس کردار میں تذکیری صفات موجود نہیں ہیں۔

ناول "چلتا مسافر" کا ایک اہم کردار مزمل ہے مزمل کے کردار میں صبر جیسی خصوصیت موجود ہے۔ مرد کے لیے ہمارا معاشرہ توقع کرتا ہے کہ وہ اپنے دکھ، درد اور غم کو لوگوں پر عیاں نہ کرے۔ مزمل نے بھی ایسا ہی کیا۔ مزمل میں انسانی ہمدردی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ وہ ہر طرح کے تعصب سے پاک ہے۔ وہ کسی بھی قسم کی علاقائی، لسانی و صوبائی تفریق کو نہیں مانتا۔ اس کے نزدیک سب کی ایک ہی قومیت ہے وہ ان میں تفرقہ نہیں رکھتا۔ رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے مطابق مثالی مرد بہادر ہوتا ہے۔ وہ ہر قسم کے حالات کا جواں مردی اور ہمت سے مقابلہ کرتا ہے۔ مزمل بھی ایسا ہی کردار ہے وہ ہمت و حوصلہ نہیں ہارتا۔ ہاجرہ کے لیے کھانے پینے کا انتظام کرنے کے بعد مزمل اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ وہ اب اس گھر میں نہیں رہیں گے بلکہ حالات کا جرأت مندانہ انداز میں مقابلہ کر کے زندگی گزاریں گے۔ وہ انسانوں کی طرح مرنے کا حوصلہ رکھتا ہے یوں چھپ کر مرنا نہیں چاہتا۔ مزمل میں حالات کا جواں مردی کے ساتھ مقابلہ کرنے جیسے تذکیری خصائص پائے جاتے ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مزمل کے کردار میں رابرٹ ووڈ کی تھیوری کے مطابق بہادری و شجاعت، انسانی ہمدردی اور لوگوں کی مدد

کرنا، صبر کرنا اور مشکل حالات کا جواں مردی سے مقابلہ کرنا اور حقیقت پسند سوچ جیسے تذکیری خصائص پائے جاتے ہیں۔ یہ ایک مثالی کردار ہے جو تذکیری تھیوری پر پورا اترتا ہے۔

بذلل رحمٰن ناول "چلتا مسافر" کا متحرک اور جاندار کردار ہے۔ بذلل نے ڈھاکہ یونی ورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ یونی ورسٹی میں اسے ایک پنجابی لڑکی سلسبیل سے محبت ہو گئی مگر اس نے اپنی محبت کا اظہار نہ کیا۔ یہ ایک ایسا تذکیری رویہ ہے جو ہمارے معاشرے میں پایا جاتا ہے کہ مرد اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہیں چاہے وہ کسی بھی قسم کے جذبات ہوں خوف کے، دکھ درد کے یا پھر محبت کے وہ اس کا اظہار نہیں کرتا کیوں کہ اس سے اس کی تذکیریت کو نقصان پہنچتا ہے۔ ہمارا معاشرہ مردوں کے لیے جارحانہ رویوں کی وضاحت کرتا ہے۔ عورت کے لیے یہ تصور کیا جاتا ہے کہ اسے اپنے جذبات و احساسات پر قابو پانا نہیں آتا۔ لیکن ناول میں سلسبیل اور بذلل دونوں کا کردار مضبوط و جاندار ہے۔ دونوں اپنے جذبات پر قابو رکھنا جانتے ہیں۔ بذلل کے کردار میں بھی اپنے جذبات پر قابو پانا جیسی تذکیری صفت موجود ہے۔ بذلل کے کردار میں جارحیت اور تشدد جیسی منفی تذکیری صفات نہیں پائی جاتیں۔ بلکہ وہ ایک حساس دل کا مالک ہے اور لوگوں کی مدد کرنے جیسی تذکیری صفت کا حامل ہے۔ رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے تناظر میں دیکھا جائے تو بذلل میں صبر، شجاعت و بہادری، لوگوں کی مدد کرنا، قائدانہ صلاحیت اور مشکل حالات کا جواں مردی سے مقابلہ کرنے جیسے خصائص پائے جاتے ہیں۔ اس حوالے سے یہ کردار ناول کا مضبوط اور جاندار اور مثالی کردار ہے۔

مدثر ناول "چلتا مسافر" کا ایک عمدہ کردار ہے۔ اپنے نظریے اور بات پر قائم رہنا بھی تذکیری خصوصیت ہے۔ مرد میں یہ خصوصیت ہونا ضروری ہے کہ وہ خوف و ہراس کے سبب اپنے فیصلے سے پیچھے نہ ہٹے بلکہ ہمت کر کے اپنے فیصلے پر قائم رہے۔ مدثر نے بھی ایسا ہی کیا وہ خوف و دہشت کے باعث اپنے فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹتا۔ اس کا فیصلہ اٹل ہے۔ لہٰذا وہ ایک طویل اور تکلیف دہ سفر طے کر کے پاکستان پہنچتا ہے۔ مدثر کی شخصیت میں دھیما پن اور شریفانہ انداز دکھائی دیتا ہے۔ اس کی وجہ اس کی تربیت اور ماں باپ کی توجہ ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کی عدم توجہی کا شکار نہیں ہوا اس وجہ سے ہی اس کی شخصیت میں دھیما پن اور لوگوں کے لیے ادب و لحاظ نظر آتا ہے۔ مزید برآں مشرقی اور مغربی پاکستان کے مابین حالات کی کشیدگی کے سبب ہجرت کرنا اور کٹھن حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے پاکستان پہنچنا اس کی بہادری کی دلیل ہے۔ رابرٹ ووڈ کی تھیوری کے مطابق مدثر کے کردار میں تذکیری خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ وہ مشکل حالات پر صبر بھی کرتا ہے اور ان کا مقابلہ بڑی بہادری اور جواں مردی سے کرتا ہے۔ وہ خوددار ہے اور اس میں کچھ کر گزرنے کا حوصلہ ہے۔ وہ بزدلوں کی طرح مرنے کا قائل نہیں ہے۔

ناول " خواب گر "کا مرکزی کردار ابراہیم ہے۔اپنے جذبات پر قابو رکھنا اور صبر کرنا ایسے تذکیری خصائص ہیں جن کو ہمارا معاشرہ مردوں کے لیے متعین کرتا ہے۔ ابراہیم میں بھی یہ تذکیری خصائص پائے جاتے ہیں۔ ابراہیم میں مثبت سوچ پائی جاتی ہے۔وہ نہیں چاہتا کہ اس کی بیوی اپنے سابقہ منگیتر کے ساتھ ناجائز اور گناہ کی زندگی گزارے اس لیے وہ اسے طلاق دے دیتا ہے۔یہ ایک مثبت تذکیری رویہ ہے وہ اس حوالے سے خود کو بھی قصوروار تصور کرتا ہے۔ ابراہیم معاشرے میں بے جان اور غیر متحرک شخص بن کر زندگی گزارنے کا قائل نہیں ہے۔وہ صبر اور بہادری سے کام لیتا ہے۔ ابراہیم کے اندر یہ تذکیری خصائص ہیں کہ وہ محض اپنی ذات کے حوالے سے نہیں سوچتا۔اس میں اپنے سے زیادہ دوسروں کے لیے جینے کا جذبہ موجود ہے۔وہ ان کی مدد کرتا ہے اور اس کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ الطاف فاطمہ نے ناول میں اکثر جگہوں پر بلتیوں کے قومی کردار اور خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ان کے سماج کا ہر فرد محنتی، جفاکش ، حلیم اور صابر ہے۔ابراہیم میں بھی یہ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ابراہیم دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہونے والا اور ان کی مدد کرنے والا شخص ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ابراہیم کے کردار میں جذبات پر قابو پانا، صبر کرنا، دوسروں کی مدد کرنا، تنہائی پسندی، حقیقت پسندانہ سوچ اور تشدد کو اختیار نہ کرنا جیسی مثالی تذکیری صفات موجود ہیں۔

ناول " خواب گر "کا کردار اسمٰعیل ایک صلح جُو انسان کا کردار ہے۔ اسمٰعیل کا کردار بے ضرر شخص کا ہے۔وہ کسی کو بھی رنج و تکلیف میں مبتلا نہیں دیکھ سکتا۔وہ سب کو محبت دینا جانتا ہے۔اور سب کے لیے ہمدردی اور محبت کے جذبات رکھتا ہے۔اس نے اپنی زندگی انتہائی محنت و مشقت کے ساتھ گزاری مگر ہمت نہیں ہاری۔اس نے اپنے حالات پر صبر کیا اور یہی اس کی تذکیری خصوصیت ہے۔

علی مردان کا کردار ناول " خواب گر "کا ایک مثبت کردار ہے۔ علی مردان میں رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے مطابق حقیقت پسندانہ سوچ پائی جاتی ہے۔وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ عورت کی بنیادی ضروریات کے علاوہ دوسری ضرورت بھی ہوتی ہے جس کو پورا کرنا مرد کے ذمے ہے۔ یہاں پر ماہ رو کو بے راہ روی اور گمراہی کے راستے پر چلنے کے باوجود بھی عورت ہونے کا فائدہ حاصل ہے۔ علی مردان ایک متحرک کردار ہے۔اس نے اپنے تمام حالات کا بہادری سے مقابلہ کیا۔رابرٹ ووڈ کی تذکیری تھیوری کے مطابق علی مردان میں حقیقت پسند سوچ، صبر و بہادری، مدد کرنا اور محنت و جفاکشی جیسے تذکیری خصائص موجود ہیں۔جو کہ ایک کردار کو مثالی بناتے ہیں۔

فریڈرک ہسٹن ہندوستانی نژاد برطانوی شخص ہے اور ناول "خواب گر" میں ایک مددگار کردار کے طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ فریڈرک ہسٹن کے کردار کا مثبت پہلو ہے کہ وہ آقا ہو کر اپنی محکوم قوم کے ساتھ کی جانے والی اس

زیادتی اور ناانصافی کا اعتراف کرتا ہے اس کی شخصیت کا یہ پہلو اسے دوسرے انگریزوں سے مختلف بناتا ہے رابرٹ ووڈ کی تھیوری کے مطابق اس میں حقیقت پسندانہ سوچ جیسی خصوصیت پائی جاتی ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ تمام کردار تذکیری خصوصیات کے حامل ہیں انھیں ان کی خصوصیات کے ساتھ ناولوں میں پیش کیا گیا ہے جو ہندوستانی مردوں کا خاصا ہے۔ان کے ناولوں کے مرکزی کردار جیسے "نشان محفل "کے کردار نادر اور اویناش "دستک نہ دو "کا کردار صفدر یاسین، "چلتا مسافر "کے کردار مزمل اور بذلل الرحمٰن "خواب گر" ناول کا ابراہیم مثالی آدمی کی تشکیل کرتے ہیں۔مگر ان ناولوں کے دیگر کردار بھی تذکیری خصوصیات کے حامل کردار ہیں۔اگرچہ ان ناولوں کے چند کرداروں میں غیر تذکیری رویہ بھی پایا جاتا ہے جیسے شہریار اور ایبک کے کردار ہیں مگر غیر تذکیری رویے کے باوجود بھی ان میں چند تذکیری خصائص موجود ہیں۔ان ناولوں کے کردار اپنی تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں اور اپنی روایتوں کے پاس دار ہیں۔انھیں ان کی خصوصیات کے ساتھ ناولوں میں پیش کیا گیا ہے۔

کتابیات

کتابیات

اسلم آزاد، ڈاکٹر۔اردو ناول آزادی کے بعد۔یوپی: نکھار پبلی کیشنز، ۱۹۸۱۔

ایم۔سلطانہ بخش، ڈاکٹر۔پاکستانی ادبیات میں خواتین کا کردار۔اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی۔۱۹۹۶ء۔

بخاری، سہیل۔اردو ناول نگاری۔دہلی: الحمر پبلیشرز، ۱۹۷۲ء۔

تارڑ، مستنصر حسین۔"دستک نہ دو "الطاف فاطمہ۔۔۔ہزار داستان۔ اخبار: روزنامہ ایکسپریس، (۱۳ جنوری ۲۰۱۹)۔

تسنیم آصف۔الطاف فاطمہ کی ناول نگاری: فکری و فنی جائزہ۔ مقالہ برائے ایم۔فل، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد، ۲۰۰۴ء۔

خاتون، بدرہ۔پاکستانی ناول پر تقسیم ہند کے اثرات۔مقالہ برائے ایم فل، علامہ اقبال اوپن یونی روسٹی، ۲۰۰۵ء۔

خالد اشرف، ڈاکٹر۔برصغیر میں اردو ناول۔لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۵ء۔

رشید، شاہد۔"مشرقی پاکستان کی علیحدگی: اسباب و وجوہات"۔روزنامہ نوائے وقت۔۱۶ دسمبر ۲۰۱۷۔

رفیق، آمنہ / نسیمہ رحمان، ڈاکٹر۔"الطاف فاطمہ کی ترجمہ نگاری"۔مشمولہ تحقیق نامہ۔شمارہ ۲۳۔(جولائی تا دسمبر ۲۰۱۸ء)۔

ریاض ہمدانی، ڈاکٹر۔اردو ناول کا نو آبادیاتی مطالعہ۔لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۸۔

سائرہ بتول، ڈاکٹر، محمد احمد قادری، ڈاکٹر، روبینہ پروین، ڈاکٹر۔سماجی تذکیریت کے تناظر میں ناول "خواب گر" کا تجزیاتی مطالعہ۔مشمولہ حرف سخن۔ج۵۔ش۳(۲۰۲۱ء)۔

سدید، انور۔اردو ادب کی مختصر تاریخ۔اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱۔

سلطانہ بخش، ڈاکٹر۔پاکستانی اہل قلم خواتین: ایک ادبی جائزہ۔اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۳۔

سلیم اختر، ڈاکٹر۔اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ: آغاز سے ۲۰۱۰ء تک۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء۔

سید احمد دہلوی، مولوی۔فرہنگ آصفیہ۔دہلی: نیشنل اکاڈمی انصار مارکیٹ دریا گنج، ۱۹۷۴۔

عظمت رباب، ڈاکٹر، صائمہ ارم، ڈاکٹر- "الطاف فاطمہ کے ناول خواب گر کا تجزیاتی مطالعہ"- مشمولہ تحقیق نامہ- شمارہ ۲۳-(جولائی تا دسمبر ۲۰۱۸ء)۔

عظمت رباب، ڈاکٹر، محمد خان اشرف، ڈاکٹر- "آزادی کا تصور، ہجرت اور چلتا مسافر"۔ مشمولہ نور تحقیق۔ جلد دوم، شمارہ ۷ (جولائی تا ستمبر ۲۰۱۸ء)۔

فاروقی، احسن فاروقی۔ ناول کیا ہے۔ لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۰ء۔

فاطمہ، الطاف۔ نشان محفل۔ لاہور: دارالبلاغ، س ن۔

فاطمہ، الطاف۔ دستک نہ دو۔ لاہور: فیروز سنز، س ن۔

فاطمہ، الطاف۔ چلتا مسافر۔ لاہور: جمہوری پبلیکیشنز، ۲۰۱۶ء۔

فاطمہ، الطاف۔ خواب گر۔ لاہور: جمہوری پبلیکیشنز، ۲۰۱۶ء۔

فیروزالدین، مولوی۔ فیروز اللغات جامع. لاہور: فیروز سنز، س ن.

کائنات پروین۔ الطاف فاطمہ کے افسانوں میں ناسٹیلجیائی عناصر۔ مقالہ برائے ایم فل، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد، ۲۰۲۱ء۔

کنور نسیم، پرفیسر۔ دستک نہ دو: مکمل شرح۔ لاہور: علی گڑھ پبلشرز، ۲۰۰۷ء۔

گوریجہ، رشید احمد۔ اردو میں تاریخی ناول۔ لاہور: البلاغ، ۱۹۹۶ء۔

محمود، حمیرا۔ "الطاف فاطمہ کی افسانہ نگاری" مقالہ برائے ایم ایس، دی گورنمنٹ صادق کالج وومن یونی ورسٹی بہاولپور، ۲۰۲۰ء۔

محمود، صفدر۔ پاکستان کیوں ٹوٹا۔ لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، س۔ن۔

محمد فضل حق خیر آبادی (مترجم: عبدالشاہد خان شروانی)، باغی ہندوستان۔ لاہور: مکتبہ قادریہ، ۱۹۴۷ء۔

محمد نصراللہ خان۔ اردو شاعری میں مکالمہ نگاری کی روایت۔ شنکر گٹہ: کوئمپو یونی ورسٹی، ۲۰۱۳ء۔

ممتاز احمد خان، ڈاکٹر۔ آزادی کے بعد اردو ناول: ہیئت، اسالیب اور رجحانات۔ کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۷ء۔

نجمہ صدیق، ڈاکٹر۔ پاکستانی خواتین کے رجحان ساز ناول۔ لاہور: اظہار سنز، ۲۰۰۸ء۔

نورالحسن نیئر، مولوی۔ نور اللغات. نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ زبان، ۱۹۹۸.

ہاشمی، رفیع الدین۔ اصناف ادب۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء۔

یٰسین، ڈاکٹر۔ناول کا فن اور نظریہ۔لاہور: میٹرو پرنٹرز، ۲۰۱۳۔

https://www.google.com/amp/s/www.nawaiwaqt.com.pk/16-Dec-2017/728101%3fversion=amp

الطاف-فاطمہ-سے-ماہ-پارہ-صفدر-کی-گفتگو-October 20,2020-8:49PM.

Robertwood-"How to write a damn good man"-standout books.com-accessed October 24,2020- https://www.standoutbooks.com/writing-male-characters

https://www.lexico.com/definition/masculinity تاریخ ملاحظہ ۲۸ دسمبر ۲۰۲۱۔

https://www.merriam-webster.com/dictionary/masculinity

https://www.oxfordlearnersdictionaries.com/definition/english/masculinity تاریخ ملاحظہ ۲۸ دسمبر ۲۰۲۱ء۔

https://www.collinsdictionary.com/dictionary/english/masculinity تاریخ ملاحظہ ۲۸ دسمبر ۲۰۲۱ء۔

https://www.google.com/amp/s/dictionary.cambridge.org/amp/learner-english/masculinity تاریخ ملاحظہ ۲۸ دسمبر ۲۰۲۱ء۔

https://www.yourdictionary.com/masculinity تاریخ ملاحظہ ۲۸ دسمبر ۲۰۲۱ء۔

https://www.macmillandictionary.com/dictionary/british/masculinity تاریخ ملاحظہ ۲۸ دسمبر ۲۰۲۱ء۔

https://www.vocabulary.com/dictionary/masculinity تاریخ ملاحظہ ۲۸ دسمبر ۲۰۲۱ء۔

https://www.google.com/amp/s/www.urbandictionary.com/define.php%3fterm=masculinity&amp=true تاریخ ملاحظہ ۲۸ دسمبر ۲۰۲۱ء۔

https://www.sciencedirect.com/science/article/pii/S1877042815050909 تاریخ ملاحظہ ۱۵ دسمبر ۲۰۲۱ء۔

https://www.researchgate.net/publication/304125569_Gender_Roles_and_Society تاریخ ملاحظہ ۱۳ دسمبر ۲۰۲۱ء۔

https://www.researchgate.net/publication/333406233_Concept_of_Masculinity_in_Men/link/5cec8361299bf109da750101/download تاریخ ملاحظہ ۱۷ دسمبر ۲۰۲۱ء۔

الطاف-فاطمہ-سے-ماہ-پارہ-صفدر-کی-گفتگو-October20,2020-8:49PM.

http://samt.bazmeurdu.net/article/

International Islamic University ISLAMABAD